الرسالہ

سرپرست
مولانا وحید الدین خاں

اتحاد کیا ہے ———————

اختلاف کے باوجود متحد ہو کر رہنا

فروری ۱۹۸۴ء قیمت فی پرچہ — تین روپے شمارہ ۸۷

اسلامی مرکز کا ترجمان

الرسالہ

فروری ۱۹۸۴
شمارہ ۸۷

سی-۲۹- نظام الدین ویسٹ - نئی دھلی ۱۱۰۰۱۳

اعلان

ادارۂ الرسالہ اور اسلامی مرکز کے لئے ہمارا نیا پتہ نوٹ فرمائیں:

سی - ۲۹- نظام الدین ویسٹ- نئی دھلی ۱۱۰۰۱۳

C-29, Nizamuddin West,
New Delhi 110 013
Telephone : 611128

زرتعاون سالانہ ۳۶ روپیہ • خصوصی تعاون سالانہ دوسو روپے • بیرونی ممالک سے ۲۰ ڈالر امریکی

خود جاننا پڑتا ہے

ٹائمس آف انڈیا (۱۸ جولائی ۱۹۸۲) میں ایک دلچسپ قصہ شائع ہوا ہے۔ ہندستان کے ایک لیڈر (جن کا نام درج نہیں) ۱۹۷۰ میں فرانس گئے۔ پیرس میں ان کی ملاقات ایک فرانسیسی لیڈر سے ہوئی جو حکمراں گالسٹ پارٹی سے تعلق رکھتا تھا۔ اخبار کی رپورٹ کے مطابق ہندستانی لیڈر اور فرانسیسی لیڈر کے درمیان گفتگو کا ایک حصہ حسب ذیل تھا:

> "Is there anything in particular you would like to do in Paris." Asked the Gaulist.
> "I am a great admirer of de Gaulle." replied the Indian visitor. "I should like to make a courtesy call on him."
> "But he is dead, sir."
> "What? Nabody told me in India during the briefing."
> "They must have presumed you were aware of it. He died four years ago."

فرانسیسی لیڈر نے پوچھا "کیا آپ پیرس میں کوئی خاص چیز پسند کریں گے" ہندستانی لیڈر نے جواب دیا "میں جنرل ڈیگال سے بہت متاثر ہوں اور میری خواہش ہے کہ ان سے ملاقات کروں" کہنے والے نے کہا "مگر جناب ان کا تو انتقال ہو گیا" ہندستانی لیڈر نے کہا "کیا، ہندستان میں فرانس کے حالات بتاتے ہوئے تو کسی نے مجھ سے یہ بات نہیں کہی" کہنے والے نے دوبارہ کہا "انھوں نے فرض کیا ہوگا کہ آپ ان کو جانتے ہیں۔ جنرل ڈیگال چار سال پہلے مر چکے ہیں"

یہ ایک مثال ہے جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ ہر بات بتائی نہیں جا سکتی۔ ضروری ہے کہ آدمی خود کچھ باتوں کو جانے۔ سننے والا اگر پچاس فیصد بات جانتا ہو تو اس کو بقیہ پچاس فی صد بات بتائی جا سکتی ہے۔ اگر وہ نصف بات پہلے سے نہ جان چکا ہو تو بقیہ نصف بھی وہ نہ جان سکے گا۔ خواہ وہ بات کتنی ہی معقول ہو اور کتنے ہی زیادہ دلائل کے ساتھ اس کو پیش کر دی جائے۔

آج کسی سے کہئے کہ "فلاں کھلاڑی نے سنچری بنائی" تو وہ فوراً سمجھ لے گا کہ اس سے مراد کرکیٹ کے ایک سو رن ہیں۔ مگر یہ کہئے کہ "قوم کی ترقی کے لئے ایک سنچری کی جدوجہد درکار ہے" تو اس کو کوئی نہیں سمجھتا۔ کیوں کہ تعمیر قوم کے معاملہ میں سو سالہ جدوجہد سے کوئی واقف نہیں۔

بے خبر انسان

آئیوری کوسٹ مغربی افریقہ کا ایک ساحلی ملک ہے۔ یہاں بجلی افراط کے ساتھ پائی جاتی ہے۔ گھروں اور دکانوں کی جگمگاہٹ کی وجہ سے اس کو افریقہ کا شوکیس کہا جاتا تھا (ٹائمس آف انڈیا ۴ جنوری ۱۹۸۴)

دسمبر ۱۹۸۳ میں اچانک وہ ایسا ملک بن گیا جہاں لوگ عالی شان ہوٹلوں میں موم بتی کی روشنی میں کھانا کھائیں اور گھروں اور دفتروں کو بھی موم بتی سے روشن کریں۔ آئیوری کوسٹ میں ۹۲ فی صد پن بجلی کا رواج تھا۔ مگر بارش رک جانے کی بنا پر ڈیم سوکھ گئے اور اکثر ٹربائن کا چلنا بند ہوگیا۔ چنانچہ بجلی کی کٹوتی کا یہ عالم ہوا کہ بعض اوقات مسلسل ۱۸ گھنٹے تک بجلی غائب رہی۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ صنعتی پیداوار گھٹ کر ۲۵ فی صد رہ گئی۔ کمپوٹر، الکٹرک ٹائپ رائٹر، ریفریجریٹر، اور اکثر بجلی سے چلنے والی چیزیں بند رہنے لگیں۔

بہت سے بڑے بڑے تاجروں نے اس اندیشہ سے دفتر جانا چھوڑ دیا کہ کہیں وہ لفٹ میں اٹک کر نہ رہ جائیں۔ ایک تاجر نے اپنا حال بتاتے ہوئے نیویارک ٹائمز کے نمائندہ سے کہا کہ سالہا سال سے میرا یہ حال تھا کہ میں اپنے ایرکنڈیشنڈ مکان سے ایرکنڈیشنڈ کار میں اور پھر ایرکنڈیشنڈ دفتر میں جاتا تھا۔ میں نے کبھی یہ جانا ہی نہیں کہ حقیقۃً آئیوری کوسٹ کتنا زیادہ گرم ہے :

> For years, I had gone from my air-conditioned villa to my air-conditioned car to my air-conditioned office. I never realised just how hot it really is here.

افریقہ جیسے گرم ملک میں ایرکنڈیشنڈ ماحول میں رہنے والا تاجر گویا ایک مصنوعی دنیا میں رہ رہا تھا۔ جب بجلی نے اس کا ساتھ چھوڑ دیا اس وقت اس کو معلوم ہوا کہ اصل صورت حال اس کے برعکس تھی جس کو وہ اپنے ذہن میں بطور خود فرض کئے ہوئے تھا۔

یہی حال زیادہ بڑے پیمانے پر تمام انسانوں کا ہے۔ انسان موجودہ دنیا میں اپنے آپ کو آزاد پاتا ہے وہ سمجھتا ہے کہ جو کچھ اس کے پاس ہے وہ اس کی ملکیت ہے۔ جب انسان کی موت آئے گی اس وقت اچانک اس کو معلوم ہوگا کہ یہ محض فریب تھا ـــــ اس نے امتحان کی آزادی کو استحقاق کی آزادی سمجھ لیا تھا۔ اس نے خدا کے اثاثہ کو اپنا اثاثہ فرض کر لیا تھا۔ وہ اپنے اعمال کے لئے خدا کے یہاں جواب دہ تھا مگر وہ اس غلط فہمی میں مبتلا ہوگیا کہ وہ خواہ کچھ بھی کرے کوئی اس سے پوچھ گچھ کرنے والا نہیں۔

خدا سے نسبت

ایک بزرگ فجر کی نماز کے وقت اپنے گھر سے نکلے اور تیزی سے مسجد کے لئے روانہ ہوگئے مگر جب وہ مسجد کے اندر داخل ہوئے تو ان کے قدموں کی رفتار سست ہوگئی۔ اس وقت اگرچہ پہلی صف میں کافی جگہ تھی۔ مگر وہ پیچھے کی صف میں رک گئے اور مسجد کے ایک کنارے بیٹھ کر جماعت کا انتظار کرنے لگے۔ نماز کے بعد ایک شخص نے پوچھا کہ حضرت، یہ کیا بات ہے کہ آپ مسجد کی طرف تیزی سے روانہ ہوئے مگر جب مسجد کے اندر پہنچے تو بڑھ کر اگلی صف میں جگہ لینے کے بجائے پچھلی صف میں ایک گوشہ میں بیٹھ گئے۔

بزرگ نے جواب دیا کہ بات یہ ہے کہ جب میں گھر سے مسجد جانے کے لئے نکلا تو مجھ کو ایسا لگا کہ میں ایک ایسی جگہ جا رہا ہوں جہاں خدا کی رحمت و مغفرت تقسیم ہو رہی ہے۔ اس وقت شوق ہوا کہ میں لپک کر جلدی سے وہاں پہنچوں۔ مگر جب اندر داخل ہوا تو خدا کی عظمت کے مقابلہ میں اپنے عجز کا احساس مجھ پر غالب آگیا اور میرے قدموں کی رفتار اچانک سست پڑ گئی۔

"آپ سست قدموں سے بھی تو اگلی صف میں جا سکتے تھے" آدمی نے دوبارہ پوچھا۔ بزرگ نے کہا کہ تمہارا یہ کہنا صحیح ہے۔ مگر اس وقت مجھ پر یہ احساس طاری ہوا کہ خدا کی رحمت و مغفرت کا خزانہ تو ختم ہونے والا نہیں۔ اگر میں پیچھے بیٹھ جاؤں تب بھی اس کی تقسیم کا سلسلہ ضرور یہاں تک پہنچ جائے گا۔

اس کے بعد بزرگ نے کہا کہ بندے کی نجات کا دارومدار اس پر ہے کہ وہ خدا کی صفات کا ادراک کرے۔ بندے اور خدا کے درمیان اس کی صفات ہی کے ذریعہ اتصال قائم ہوتا ہے۔ جب کوئی شخص خدا کی صفتوں میں سے کسی صفت کا ادراک کرتا ہے تو گویا وہ اپنے آپ کو خدا کی زد میں لاتا ہے۔ جس طرح سورج کسی کو اس وقت روشن کرتا ہے جب کہ وہ اپنے آپ کو اس کی کرنوں کی زد میں لائے۔ اسی طرح ایک بندہ اس وقت اپنے رب کی زد میں آتا ہے جب کہ وہ خدا کی صفات کی معرفت حاصل کرے۔

بزرگ جب مسجد کی طرف جا رہے تھے تو انھوں نے خدا کی یہ حیثیت دریافت کی کہ خدا دینے والا ہے، اس کے سوا کوئی دینے والا نہیں۔ جب وہ مسجد میں داخل ہوئے تو انھوں نے خدا کے بڑے ہونے کو پہچانا اور اس کے مقابلہ میں اپنے عجز کو دریافت کیا۔ پہلے مرحلہ میں انھوں نے معطی ہونے کی حیثیت سے خدا سے نسبت قائم کی اور دوسرے مرحلہ میں خدا کے علی و کبیر ہونے کی حیثیت سے۔

خدا کی تلاش

ایک بے حد ذہین شخص تھا۔ وہ مستقل طور پر اس احساس میں مبتلا رہتا تھا کہ میں زندگی میں اپنے واقعی مقام کو نہ پا سکا۔ بالآخر اس نے خودکشی کر لی۔ اس نے اپنی خودکشی کی تحریر میں لکھا تھا:

میں اپنی زندگی کو ختم کر رہا ہوں۔ کیوں کہ میں شاید ایسی دنیا میں بھٹک آیا جس کے لئے میں پیدا نہیں کیا گیا تھا۔

کمی کا یہ احساس اکثر ان لوگوں کا پیچھا کئے رہتا ہے جو فطرت سے غیر معمولی ذہن لے کر پیدا ہوئے ہوں۔ وہ یا تو مایوسی اور ناکامی کی زندگی گزار کر طبعی موت مرتے ہیں یا خودکشی کر لیتے ہیں۔ کم تر ذہن رکھنے والوں میں ایسے لوگ کافی مل جائیں گے جو بظاہر مطمئن زندگی گذارتے ہوں۔ مگر برتر ذہن رکھنے والوں میں مشکل ہی سے کوئی شخص ملے گا جو مطمئن زندگی حاصل کرنے میں کامیاب ہوا ہو۔

اس کی وجہ انسان کی معیار پسندی ہے۔ ہر انسان فطری طور پر آئیڈیل کی تلاش میں ہے۔ مگر موجودہ دنیا میں آئیڈیل کو پانا اتنا مشکل معلوم ہوتا ہے کہ یہ مثل بن گئی ہے کہ معیار کبھی حاصل نہیں کیا جا سکتا:

(Ideal cannot be achieved)

اب ہوتا یہ ہے کہ کم تر درجہ کا ذہن رکھنے والوں میں چونکہ شعور بہت زیادہ بیدار نہیں ہوتا۔ وہ آئیڈیل اور غیر آئیڈیل کے درمیان بہت زیادہ فرق نہیں کر پاتے۔ وہ اپنے موٹے ذوق کی وجہ سے غیر آئیڈیل میں بھی اس طرح مشغول ہو جاتے ہیں جیسے کہ وہ ان کا آئیڈیل ہو۔ مگر جو لوگ زیادہ ذہین ہیں وہ آئیڈیل اور غیر آئیڈیل کے فرق کو فوراً محسوس کر لیتے ہیں اور اس بنا پر آئیڈیل سے کم کسی چیز پر اپنے کو راضی نہیں کر پاتے۔

انسان کا آئیڈیل ایک ہی ہو سکتا ہے اور وہ اس کا خالق اور رب ہے۔ اعلیٰ ذہن کے لوگ جس چیز کی تلاش میں ہیں وہ ربانی مشن کے سوا اور کچھ نہیں۔ خدا کا وجود ہی آئیڈیل وجود ہے۔ اور خدا کے مشن میں اپنے کو مشغول کر کے ہی ہم اس چیز کو پا سکتے ہیں جو ہماری پوری ہستی کو تسکین دے اور آئیڈیل کے بارہ میں ہمارے ذہنی معیار پر مکمل طور پر پورا اترے۔

انسان کا آئیڈیل اس کا خدا ہے، مگر وہ اپنے اس آئیڈیل کو نا کام طور پر غیر خدا میں تلاش کر رہا ہے۔

پیغمبر کو ماننا

لوئی بونیل (Luise Bumule) فرانس کا مشہور فلم پروڈیوسر ہے۔ وہ ۱۹۰۰ میں پیدا ہوا۔ اور ۱۹۸۳ میں وفات پائی۔ ابتداً اس کو مسیحیت کی تعلیم دی گئی۔ اس کے بعد وہ فلمی صنعت میں داخل ہوگیا۔

گارجین، اگست ۱۹۸۳ میں اس کے کچھ خیالات شائع کئے گئے ہیں۔ اس نے کہا کہ آج بے شمار لوگ مسیحی ہیں۔ مگر وہ اضافی طور پر مسیحی ہیں نہ کہ حقیقی طور پر۔ حضرت مسیح اگر آج زمین پر واپس آئیں تو ان کے ماننے والے دوبارہ ان کو سولی پر چڑھا دیں گے:

If Christ came back, they'd crucify Him all over again

لوئی بونیل کی یہ بات صدفی صد درست ہے۔ یہ ایک حقیقت ہے کہ مروجہ مسیحیت حضرت مسیح کے لائے ہوئے مذہب سے اتنی مختلف ہے کہ آج اگر حضرت مسیح زندہ ہوں تو خود ان کے ماننے والے انھیں برداشت نہ کریں۔

تاہم مسلمانوں کا حال بھی اس معاملہ میں ان سے کچھ زیادہ مختلف نہیں۔ آج دنیا بھر میں تقریباً ایک ارب مسلمان ہیں جو محمد صلے اللہ علیہ وسلم کے معتقد ہیں اور ان کے نام پر لڑنے مرنے کے لئے تیار رہتے ہیں۔ مگر ان مسلمانوں کا سارا جوش محمدؐ کی تاریخ سے ہے نہ کہ خود محمدؐ سے۔ وہ "محمد" جس کے ساتھ تاریخ شامل نہ ہو وہ موجودہ مسلمانوں کے لئے بھی اتنا ہی اجنبی ہے جتنا وہ اپنے ہم زمانہ لوگوں کے لئے تھا۔

محمد صلے اللہ علیہ وسلم کے ساتھ پچھلے چودہ سو سال میں عظمت کی جو روایات جمع ہوچکی ہیں۔ اگر آپ کی ذات سے ان کو ہٹا دیا جائے اور آپ دوبارہ اسی ابتدائی حالت میں ظاہر ہوں جیسا کہ آپ قدیم مکہ میں ظاہر ہوئے تھے تو مجھے اپنے علم و تجربہ کی حد تک یقین ہے کہ مسلمانوں میں آپ کو پہچاننے والے اتنے بھی نہ نکلیں گے جتنی ایک آدمی کے ہاتھ میں انگلیوں کی تعداد ہوتی ہے۔

مسلم اداروں میں جس محمد کی دھوم ہے وہ تاریخی محمد ہیں نہ کہ وہ محمد جو تاریخ بننے سے پہلے تھے۔ تاریخ بننے سے پہلے والے محمد اگر آج ان اداروں میں آجائیں تو ان کو نہ کوئی ادارہ شیخ التفسیر بنائے اور نہ شیخ الحدیث۔ ان کو نہ کسی جلسہ کی صدارت ملے اور نہ کسی جماعت کی امارت۔ مسلمانوں کی بستی سے وہ اسی طرح بے رحمی کے ساتھ نکال دئے جائیں جس طرح مکہ والوں نے اپنے زمانہ کے محمدؐ کو نکال دیا تھا۔ قدیم مکہ والے محمدؐ کو پانے کے لئے جوہر کی بنیاد پر قدردانی درکار ہے اور مسلمان آج اس صفت سے محروم ہیں۔

قدردانی

مسٹر جی ڈی برلا (۱۹۸۳-۱۸۹۴) کی عمر جب ۳۰ سال تھی اس وقت انھیں ایک غیر معروف طالب علم کا خط ملا۔ یہ خط کلکتہ سے آیا تھا۔ طالب علم نے بے تکلفانہ اور حوصلہ مندانہ انداز میں لکھا تھا کہ اگر آپ میری صرف اتنی مدد کریں کہ مجھ کو ایک خاص آلہ خریدنے کے لئے ۲۲ ہزار روپے دے دیں جس کو باہر سے منگوانا ہے تو میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ میں اپنی دریافت پر نوبل انعام حاصل کرنے کے قابل ہو سکوں گا:

> If only you can help me with an amount of Rs. 22,000 for the purchase of a special type of instrument which has to be imported, I may assure you that I may be able to get the Nobel prize for my discovery.

اس پر اثر جذباتی اپیل کا جو فوری جواب مسٹر برلا نے مذکورہ طالب علم کو بھیجا اس کے ساتھ ۲۲ ہزار روپے کا چیک بھی شامل تھا۔ طالب علم نے اس رقم سے مذکورہ سائنسی آلہ درآمد کیا اور اس کے ذریعہ اپنی تحقیق جاری رکھی۔ طالب علم کا اندازہ صحیح نکلا۔ اس کی تحقیق جب چھپ کر سامنے آئی تو اس کو اتنی شہرت حاصل ہوئی کہ اس کو سائنس کا نوبل انعام دیا گیا (ہندستان ٹائمس ۱۲ جون ۱۹۸۳)

یہ طالب علم وہی تھا جو بعد کو سر سی۔ وی۔ رمن کے نام سے مشہور ہوا۔ نوبل انعام اور سر کا خطاب ملنے کے بعد تو ہر ایک سی۔ وی رمن کا قدرداں تھا۔ مگر جب سی۔ وی رمن محض ایک معمولی طالب علم تھے اور ان کی ساری بڑائی ابھی مستقبل کے پردہ میں چھپی ہوئی تھی اس وقت سی وی رمن کی قدر کرنا بے حد مشکل کام تھا۔ جی ڈی برلا نے یہ کام کیا اور یہی وجہ ہے کہ جی ڈی برلا ہندستان کی تاریخ میں ملک کے معماروں کی اعلیٰ ترین فہرست میں لکھے گئے۔

یہ خصوصیت جس کی ایک مثال مسٹر برلا کے مذکورہ واقعہ میں نظر آتی ہے، یہ نہ صرف افراد کو اعلیٰ مرتبہ تک پہنچاتی ہے۔ بلکہ قوم کی ترقی میں اس کا بہت گہرا حصہ ہے۔ کسی قوم میں " برلا " جیسے جوہر شناس افراد کا ہونا اس بات کی ضمانت ہے کہ اس کے نوجوانوں کی صلاحیتیں بجھ کر نہیں رہ جائیں گی۔ بلکہ اپنے چھپے ہوئے امکانات کو بر روئے کار لانے کے لئے ہر قسم کے ضروری وسائل پالیں گی۔ اس کے برعکس جس قوم میں ایسے قدرداں موجود نہ ہوں وہاں ترقی کا مقام صرف ان لوگوں کے حصہ میں آتا ہے جو اتفاقی اسباب کے تحت کسی " گدی " کو پا جائیں۔ اور ظاہر ہے کہ گدیاں تو کسی قوم میں چند ہی ہوتی ہیں۔

ایک حدیث

عن ابی ھریرۃ رضی اللہ عنہ ان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم قال: ان اللہ یرضیٰ لکم ثلاثاً۔ یرضی لکم ان تعبدوہ ولا تشرکوا بہ شیئاً وان تعتصموا بحبل اللہ جمیعا ولا تفرقوا وان تناصحوا من ولاہ اللہ امرکم۔ و یسخط لکم ثلاثا۔ قیل وقال وکثرۃ السؤال واضاعۃ المال

(شرح ۱ مسلم)

حضرت ابوہریرہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ اللہ تم سے تین باتوں پر راضی ہوتا ہے۔ وہ اس پر راضی ہوتا ہے کہ تم اس کی عبادت کرو اور اس کے ساتھ کسی چیز کو شریک نہ کرو اور سب مل کر اللہ کی رسی کو پکڑے رہو اور متفرق نہ ہو۔ اور یہ کہ اللہ جس شخص کو تمہارا امیر بنائے اس کی خیر خواہی کرو۔ اور اللہ تم سے تین باتوں پر ناراض ہوتا ہے۔ قیل وقال سے۔ سوال کی کثرت سے اور مال کو ضائع کرنے سے۔

اللہ کی عبادت سے مراد یہ ہے کہ اللہ تمام توجہات کا مرکز بن جائے۔ اللہ کے بغیر آدمی کو اپنی زندگی سونی معلوم ہونے لگے۔ اس کے مقابلہ میں شرک یہ ہے کہ اللہ کے سوا کسی اور چیز کو آدمی اپنی دلچسپی اور توجہ کا مرکز بنالے۔ شرک کو چھوڑنا اور اللہ کا عبادت گذار بننا آدمی کو بے نفس اور بے انا بناتا ہے۔ جن لوگوں کے اندر یہ خصوصیات پیدا ہو جائیں وہ یقینی طور پر آپس میں جڑ جائیں گے۔ وہ ایک دوسرے سے کٹ کر نہیں رہ سکتے۔ اسی طرح جو شخص مسلمانوں کے اجتماعی معاملات کا ذمہ دار ہو اس کے بارہ میں مسلمانوں کا رویہ خیر خواہ جیسا ہونا چاہئے نہ کہ حریف جیسا۔ مسلم کی ایک اور روایت کے مطابق دین ہر ایک کے لئے نصیحت (خیر خواہی) کا نام ہے اور اسی طرح حکمرانوں کے لئے بھی (ولائمۃ المسلمین) عام لوگ جب حکمرانوں کے اندر برائی دیکھتے ہیں تو اس کے خلاف ہنگامے کرتے ہیں اور اس کو تخت سے بے دخل کرنے کی مہم چلاتے ہیں۔ مگر مومن کا طریقہ یہ ہے کہ وہ محبت کے ساتھ حکمراں کی اصلاح کی کوشش کرے۔

اللہ کو ایسے بندے پسند ہیں جو قول سے زیادہ عمل سے دلچسپی رکھتے ہوں۔ اس لئے وہ قیل وقال کی بحث سے سخت ناراض ہوتا ہے۔ وہ ایسے لوگوں پر غضب ناک ہوتا ہے جو غفلت اور بے حسی میں پڑے رہتے ہیں اور غیر ضروری سوالات کرتے رہتے ہیں۔ اسی طرح اللہ جن لوگوں کو مال دے اور اس کو وہ حقیقی مد میں خرچ کرنے کے بجائے ادھر ادھر ضائع کرتے رہیں وہ خدا کی نظر میں بد ترین جانور ہیں۔ خدا کبھی ایسے لوگوں پر اپنی رحمت کا سایہ نہیں کرے گا۔

مومن و کافر کا فرق

قرآن کی سورہ نمبر ۷۸ میں بتایا گیا ہے کہ جب قیامت آئے گی اور سارے لوگ خدا کے حضور جمع کئے جائیں گے تاکہ وہ اپنی اس کمائی کو دیکھیں جو انھوں نے اپنے آگے کے لئے بھیجی تھی۔ اس وقت منکر اور سرکش کا یہ حال ہوگا کہ جب وہ اپنے انجام کو دیکھے گا تو کہہ اٹھے گا: اے کاش میں مٹی ہوتا (ویقول الکافر یالیتنی کنتُ ترابا)

حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کے بارہ میں روایات میں آتا ہے کہ جب ان کو ابو لولو فیروز نے زخمی کیا اور آپ کا آخر وقت آگیا تو آپ کے صاحبزادے آپ کا سر اپنی ران پر رکھے ہوئے تھے حضرت عمر نے کہا: اے عبد اللہ، میرا رخسار زمین سے ملا دے (الصق خدی بالارض یا عبداللہ) آپ کے صاحبزادے نے ایسا ہی کیا۔ اس کے بعد حضرت عمر نے اپنا چہرہ زمین پر رکھ کر کہا۔ اے عمر، تیری خرابی ہے اور تیری ماں کی خرابی ہے، اگر خدا نے تجھے معاف نہ کیا۔ اس کے بعد آپ کی وفات ہوگئی (طبقات ابن سعد)

ان دونوں واقعات کا مقابلہ کر کے دیکھئے۔ جو بات کافر کی زبان سے آخرت میں نکلے گی وہ مومن کی زبان سے اسی دنیا میں نکل رہی ہے۔ کافر موت کے بعد آنے والی دنیا میں چاہے گا کہ کاش وہ مٹی میں مل جاتا۔ مومن موت سے پہلے کی دنیا میں کہہ رہا ہے کہ مجھے مٹی میں ملا دو۔

خدا جب سامنے ظاہر ہو جائے گا تو کس کی مجال ہے کہ اس سے سرکشی کرے۔ اس وقت ہر آدمی اس کے سامنے جھک جائے گا۔ مگر خدا کے لئے جھکنا صرف وہ معتبر ہے جو خدا کے سامنے آنے سے پہلے ہو۔ یہی کافر اور مومن کا فرق ہے۔ کافر اس وقت جھکے گا جب خدا عیاناً اس کے سامنے ظاہر ہو جائے۔ مگر مومن اس وقت خدا کے لئے جھک جاتا ہے جب کہ خدا ابھی پردۂ غیب میں چھپا ہوا ہے۔

لوگ خدا کے باغی صرف اس لئے ہیں کہ خدا آج ان کے سامنے موجود نہیں۔ جب خدا اپنی تمام طاقتوں کے ساتھ دکھائی دینے لگے تو کون اس کا باغی بن سکتا ہے۔ انسان تو شیر کے سامنے بھی اس کا باغی نہیں بنتا، پھر شیر کے خالق کے سامنے کون اس کا باغی بننے کی جرأت کرے گا۔

حقیقت یہ ہے کہ جو کچھ کافر پر آخرت میں گذرنے والا ہے وہ مومن پر اسی دنیا میں گذر جاتا ہے۔ کافر خدا کو دیکھ کر ڈھ پڑے گا۔ مومن وہ ہے جو خدا کو دیکھے بغیر ڈھ پڑے۔

مسلم صحافت

دور اوّل کے مسلمان اس احساس کے تحت ابھرے تھے کہ انھوں نے پایا ہے۔ اس کے برعکس موجودہ زمانہ کے مسلمان اس احساس پر کھڑے ہوئے ہیں کہ انھوں نے کھو دیا ہے۔ یہی فرق ان تمام علمی اور اخلاقی فرقوں کا اصل سبب ہے جو موجودہ زمانہ کے مسلمان اور دور اول کے مسلمانوں کے درمیان دکھائی دیتے ہیں۔

دور اول میں جن لوگوں نے اسلام قبول کیا، ان کے لئے اسلام سب سے بڑی نعمت تھا۔ اس کے برعکس موجودہ زمانہ کے مسلمانوں کے پاس جو چیز ہے وہ صرف یہ احساس ہے کہ اسلام کی تاریخ نے ان کو جو سیاسی اور قومی حیثیت دی تھی اس کو دوسری قوموں نے ان سے چھین لیا۔ یہی وجہ ہے کہ موجودہ زمانہ کے مسلمان ساری دنیا میں احساس مظلومی (Persecution Complex) میں مبتلا ہیں۔ وہ دوسری قوموں کو ظالم اور اپنے کو مظلوم سمجھے ہوئے ہیں۔ کہیں امریکی، کہیں روسی، کہیں ہندو، کہیں یہودی اور کہیں کوئی اور قوم انھیں اپنے موجودہ مسائل کا ذمہ دار نظر آتی ہے۔ اس نفسیات کا نتیجہ یہ ہوا کہ موجودہ زمانہ میں ان کی تمام سرگرمیاں محض بے فائدہ احتجاج بن کر رہ گئیں۔

اس کا اثر مسلمانوں کی صحافت پر بھی ہے۔ موجودہ زمانہ کی مسلم صحافت کا کوئی ایک مشترک نام دینا ہو تو وہ یقینی طور پر احتجاج ہوگا۔ آج مسلمانوں کا ہر اخبار اور رسالہ ایک قسم کا احتجاج نامہ بن کر رہ گیا ہے موجودہ زمانہ میں مسلمانوں کی صحافت کا واحد مقصد یہ ہے کہ وہ مسلمانوں کے قومی کیس کی وکالت کرے جب کہ صحیح مسلم صحافت وہ ہے جو اسلام کی وکالت کرنے والی ہو۔ جو اصولی بنیادوں پر چلائی جائے نہ کہ قومی بنیادوں پر۔

قومی وکالت میں قومی مسائل توجہ کا مرکز ہوتے ہیں۔ اس کے برعکس اسلام کی وکالت یہ ہے کہ خدا کے دین کو خدا کے بندوں کے سامنے پیش کیا جائے۔ قرآن سے معلوم ہوتا ہے کہ خدا نے پچھلے زمانوں میں بے شمار رسول بھیجے اور ان کے ساتھ کتابیں اتاریں۔ مگر یہ کتابیں اپنی اصلی حالت میں محفوظ نہ رہ سکیں۔ اس کے بعد پیغمبر آخر الزمان صلے اللہ علیہ وسلم آئے۔ ان پر جو کتاب اتری اس کو خدا نے کامل طور پر محفوظ کر دیا۔ اب ہماری ذمہ داری یہ ہے کہ اس صحیح آسمانی ہدایت (قرآن) کو تمام انسانوں اور تمام قوموں تک پہنچائیں۔ مسلم صحافت حقیقتہً وہی ہے جو اس طرز کی اسلامی دعوت کی نمائندہ ہو۔

مسلم صحافت اور اسلامی صحافت، دونوں میں بظاہر بہت معمولی فرق نظر آتا ہے۔ مگر

حقیقت کے اعتبار سے دونوں ایک دوسرے سے بالکل مختلف ہیں۔ ایک قومی صحافت ہے اور دوسری اصولی صحافت۔ ایک انسان کی نمائندہ ہے اور دوسری خدا کی نمائندہ۔ ایک کا مرکز توجہ دنیا کے مسائل ہوتے ہیں اور دوسری کا مرکز توجہ آخرت کے مسائل۔

مسلم قومی صحافت دوسری قوموں کو حریف کے روپ میں دیکھتی ہے۔ جب کہ اصولی اسلامی صحافت کے لیے دوسری قومیں مدعو کی حیثیت رکھتی ہیں۔ مسلم قومی صحافت کے نزدیک، دوسری قومیں ہم سے ہمارا اثاثہ چھینے ہوئے ہیں۔ جب کہ اسلامی صحافت کے نزدیک اصل واقعہ یہ ہے کہ ہمارے پاس دوسری قوموں کے لیے خدا کی ایک امانت ہے جس کو ہمیں ان قوموں تک پہنچانا ہے۔ پہلی صورت میں ہمارے اندر دوسری قوموں کے لیے نفرت کے جذبات ابھرتے ہیں، جب کہ دوسری صورت میں تمام قومیں ہمارے لئے محبت کا موضوع بن جاتی ہیں۔

یہ موجودہ زمانہ کی سب سے بڑی فکری غلطی ہے جس میں تمام دنیا کے مسلمان مبتلا ہیں۔ اس وقت مسلمانوں پر دوسری قوموں کی طرف سے جو کچھ بیت رہا ہے وہ حقیقۃً ہماری اسی کوتاہی کی خدائی سزا ہے جب تک مسلمان اپنی اس غلطی کی اصلاح نہ کریں گے وہ اسی طرح دنیا میں بے قیمت بنے رہیں گے۔

مسلم قیادت موجودہ زمانہ میں سب سے زیادہ ناکام قیادت ثابت ہوئی ہے۔ اس کی وجہ قیادت کی یہ غلطی ہے کہ اس نے مسلمانوں کے مستقبل کو تعمیر کے بجائے سیاست میں تلاش کیا۔ سیاست کا مطلب عملی طور پر یہ ہے کہ اپنے مسائل کے لئے دوسروں کے خلاف مہم چلائی جائے۔ جب کہ تعمیر یہ ہے کہ اپنے مسائل کے لئے خود اپنے اوپر بھروسہ کیا جائے۔

کرنے کا اصل کام یہ تھا کہ قوم کو اس حیثیت سے تیار کیا جائے کہ لوگوں کا شعور بیدار ہو۔ ان کے اندر کردار کی طاقت پیدا ہو۔ وہ تعلیم میں اونچے ہوں۔ وہ باہم ایک ہو کر رہنا جانیں۔ اقتصادی شعبوں میں انھوں نے اپنی جگہ بنائی ہو۔ صحافت اور ابلاغ عامہ میں وہ دوسروں سے پیچھے نہ ہوں۔ پھر سب سے بڑھ کر یہ کہ مسلمانوں کو یہ فکر دیا جائے کہ وہ صاحب نظریہ افراد ہیں اور انھیں بامقصد انسان کی حیثیت سے لوگوں کے درمیان رہنا ہے۔

انھیں چیزوں کے اوپر کسی قوم کی زندگی کا دارومدار رہے۔ مگر مسلم قیادت نے موجودہ زمانہ میں یہ کیا کہ اپنی تیسرے درجہ کی صحافت میں صرف دوسروں کے خلاف احتجاج اور مطالبہ کی مہم چلائی۔ اس نے خود اپنی تعمیر کے لیے وقت کے تقاضوں کے مطابق کوئی کام نہیں کیا۔

خدا کی یاد

قرآن میں ارشاد ہوا ہے کہ اے ایمان والو اللہ کا بہت ذکر کرو (یاایھا الذین آمنوا اذکروا اللہ ذکراً کثیراً ، الاحزاب ۴۱) اس کا مطلب بعض لوگ یہ لیتے ہیں کہ خوب زیادہ اللہ اللہ کرو۔ " اللہ "، کا لفظ ہزاروں بار دہراؤ۔ مگر اس قسم کے ذکر کا مذکورہ آیت سے کوئی تعلق نہیں ۔ قرآن میں ذکر کسی قسم کی لفظی تکرار کے معنی میں نہیں ہے بلکہ یاد کے معنی میں مذکورہ آیت کا مطلب ہے ــــ اللہ کو بہت زیادہ یاد کرو۔

قرآن میں دوسرے مقام پر ہے کہ میرا ذکر کرو، میں تمہارا ذکر کروں گا (فاذکرونی اذکرکم ، البقرۃ ۱۵۲) اس آیت میں خدا اپنے بندوں سے کہہ رہا ہے کہ تم میرا ذکر کرو، میں تمہارا ذکر کروں گا۔ ظاہر ہے کہ یہاں ذکر کو تکرارِ الفاظ کے معنی میں نہیں لیا جا سکتا۔ کیوں کہ خدا ایسا نہیں کرے گا کہ بندہ بندہ بار بار کہہ کر کسی کا ذکر کرے۔ یہاں ذکر لازمی طور پر یاد کے معنی میں ہے۔

حدیث میں آیا ہے کہ موت کا بہت زیادہ ذکر کرو (اکثروا ذکر ھادم اللذات) اس حدیث میں بھی ذکر لفظی تکرار کے معنی میں نہیں ہو سکتا۔ کیوں کہ ایسا کوئی بھی نہیں کرے گا کہ بیٹھ کر موت، موت، کہنے لگے۔ اس حدیث میں یقینی طور پر موت کا ذکر کرنے کا مطلب موت کو یاد کرنا ہے۔

ابوموسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ کی آواز بہت اچھی تھی۔ قرآن پڑھتے تو لوگ ہمہ تن گوش ہو کر سنتے۔ ایک مرتبہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو قرآن پڑھتے ہوئے سنا تو فرمایا: ابوموسیٰ کو آلِ داؤد کی خوش الحانی دی گئی ہے (لقد اوتی ابوموسیٰ مزماراً من مزامیر آل داؤد)

روایات میں آتا ہے کہ عمر فاروق رضی اللہ عنہ کی ملاقات حضرت ابوموسیٰ اشعری سے ہوتی تو اکثر ان سے کہتے کہ اے ابوموسیٰ، ہمارے رب کو ہمیں یاد دلاؤ (یا اباموسیٰ ذکّرنا ربّنا عزّ وجل) حضرت عمر کے اس قول میں بھی ذکر کسی قسم کے تکرارِ لفظی کے معنی میں نہیں ہے۔ یعنی حضرت عمر کی منشا یہ نہیں تھی کہ حضرت ابوموسیٰ ان کے پاس بیٹھ کر اللہ اللہ یا رب، رب کریں۔ اس فقرہ میں ذکر کا لفظ یاد کے معنی میں ہے۔ یعنی قرآن کا کوئی حصہ پڑھ کر ہمیں خدا کی یاد دلاؤ۔

لغت میں ذکر کے معنی یاد کے ہیں۔ اس لفظ کا یہی مفہوم شریعت میں بھی ہے۔ ذکر سے مراد اللہ اور اس باتوں کی یاد ہے۔ یعنی آدمی کو خدا سے اتنا گہرا تعلق ہو جائے کہ وہ اس کے دل و دماغ میں سما جائے۔ وہ ہر موقع پر اس کو یاد آتا رہے۔

موضوع حدیث

رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ جس نے جان بوجھ کر میرے اوپر جھوٹ باندھا تو وہ اپنا ٹھکانا جہنم میں بنالے (من کذب علی متعمداً فلیتبوأ مقعدہ من النار) یہ اور اس طرح کی دوسری روایات سے علمار نے استدلال کیا ہے کہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کی طرف ایسی بات منسوب کرنا جو آپ نے نہ کہی ہو سراسر حرام ہے۔ امام نووی نے لکھا ہے کہ جو شخص کسی روایت کے بارہ میں جانے کہ وہ موضوع ہے یا اس کے موضوع ہونے کا گمان ہو اس کو ایسی حدیث کا بیان کرنا حرام ہے ... ایسی حدیث خواہ احکام سے متعلق ہو یا ترغیب وترہیب سے یا رقاق سے، ہر حال میں اس کو بیان کرنا حرام ہے۔

علامہ ابن جوزی نے اپنی کتاب الموضوعات (جلد اول) میں لکھا ہے:

قوم وضعوا الاحادیث فی الترغیب والترهیب لیحثوا الناس فی زعمهم علی الخیر ویزجروهم عن الشر وهذا تعاط علی الشریعة ومضمون فعلهم ان الشریعة ناقصة تحتاج الی تتمة فقد اتممنا

ایک گروہ نے ترغیب وترہیب میں حدیثیں گھڑی ہیں تاکہ اپنے گمان کے مطابق وہ لوگوں کو بھلائی کی طرف لائیں اور برائی سے انھیں روکیں۔ مگر یہ شریعت پر زیادتی ہے۔ ان کے اس عمل کا مطلب یہ ہے کہ شریعت ناقص ہے، وہ تکمیل کی محتاج ہے پس ہم نے اس کو مکمل کیا ہے۔

ماضی میں جن لوگوں نے حدیثیں گھڑیں وہ عام طور پر دو قسم کے تھے۔ ایک وہ جو دل سے اسلام کے مخالف تھے۔ اور اسلام کا مذاق اڑانا چاہتے تھے۔ اس مقصد کے لئے انھوں نے مضحکہ خیز قسم کے قصے بنائے اور ان کو صحابۂ کرام اور رسول اللہ کی طرف منسوب کر کے عوام کے اندر پھیلا دیا۔

دوسرے وہ لوگ جو بذات خود مخلص تھے۔ انھوں نے دیکھا کہ ثابت شدہ احادیث عام طور پر سیدھی سادی ہیں اور عوام کے لئے زیادہ اثر انگیز ثابت نہیں ہوتیں۔ چنانچہ انھوں نے عوام کے اندر ڈرا ور شوق پیدا کرنے کے لئے طلسماتی قسم کی حدیثیں بنائیں۔ ان حدیثوں میں چھوٹے چھوٹے اعمال پر بہت بڑے بڑے ثواب کی امید دلائی گئی تھی یا بہت بڑے بڑے عذاب سے ڈرایا گیا تھا ـــــ مذکورہ دونوں گروہوں میں ایک مخلص تھا اور دوسرا غیر مخلص۔ مگر دونوں نے دین میں ایسی خرابیاں پیدا کیں جن کی تلافی اب کسی طرح ممکن نہیں۔

ذاتی عینک

جب آدمی کے ذہن پر کسی چیز کا شدید غلبہ ہو تو اس کو ہر چیز میں وہی چیز نظر آتی ہے۔ ایک شخص بھوکا ہے اور روٹی کے لئے تڑپ رہا ہے۔ اس سے اگر پوچھا جائے کہ دو اور دو مل کر کتنے ہوتے ہیں تو وہ کہے گا کہ چار روٹیاں۔ حتیٰ کہ وہ سورج اور چاند کی طرف دیکھے گا تو ان کی گولائی میں بھی اس کو روٹی کی صورت دکھائی دے گی۔ اسی حقیقت کو نظیر اکبرآبادی نے ان الفاظ میں نظم کیا ہے :

ہم تو نہ چاند سمجھیں نہ سورج ہیں جانتے　　بابا ہمیں تو یہ نظر آتی ہیں روٹیاں

یہی صورت دین میں بھی پیش آتی ہے۔ مثلاً قرآن کی ایک آیت ہے :

یا ایّہا الرسول بلّغ ما انزل	اے رسول جو کچھ تمہارے رب کی طرف سے اترا ہے
الیك من ربّك وان لم تفعل فما	اس کو پہنچا دو۔ اور اگر تم نے ایسا نہیں کیا تو تم نے اس
بلّغت رسالته والله یعصمك من الناس	کی رسالت نہیں پہنچائی اور اللہ تم کو لوگوں سے بچائے گا۔

شیعہ حضرات کے ذہن پر حضرت علی کی خلافت کا غلبہ ہے۔ وہ اسی کو سب سے بڑا دینی مسئلہ بنائے ہوئے ہیں۔ چنانچہ انھوں نے جب یہ آیت پڑھی تو فوراً ان کے ذہن نے کہا کہ اس آیت میں حضرت علی کی خلافت بلافصل کا بیان ہے۔ شیعہ علماء کا کہنا ہے کہ اس آیت میں جس چیز کی تبلیغ کا حکم ہے وہ حضرت علی کی خلافت ہے۔ آپ کو خدا نے وحی کی کہ لوگوں میں اعلان کر دو کہ میرے بعد علی ابن ابی طالب سلطنت اسلامی کے خلیفہ ہوں گے۔ ان کے نزدیک اس آیت میں عام احکام دین کی تبلیغ مراد نہیں ہے بلکہ علی کی خلافت کی تبلیغ مراد ہے۔

اسی طرح ہر آدمی کوئی نہ کوئی خیال اپنے ذہن میں لئے ہوئے ہے۔ وہ جب قرآن کو پڑھتا ہے تو اس کو اپنا خیال قرآن کے صفحات میں لکھا ہوا نظر آتا ہے۔ قرآن میں لکھا ہوا ہو کہ "کرو"، تو وہ اپنی طرف سے لفظ بڑھا کر سمجھ لیتا ہے کہ فلاں کام کرو۔

یہی مثال ان لوگوں کی ہے جن کے ذہن میں یہ بسا ہوا ہے کہ اسلام کا مقصد اسلامی حکومت قائم کرنا ہے۔ وہ قرآن میں پڑھتے ہیں کہ دین قائم کرو (اقیموا الدین) ان کا ذہن ان الفاظ سے فوراً یہ معنی نکال لیتا ہے کہ دینی حکومت قائم کرو۔ حالانکہ یہاں دین کا لفظ اجتماعی نظام کے معنی میں نہیں ہے بلکہ انفرادی تقاضوں کے بارے میں ہے۔ یعنی اس کا مطلب یہ ہے کہ ــــ ایمان اور اخلاص کی زندگی اختیار کرو۔ اپنی ذاتی زندگی میں خدا کی مرضی پر پوری طرح قائم ہو جاؤ۔

لفظی موشگافی

ہندستان کی آزادی سے پہلے کا واقعہ ہے۔ ایک ہندستانی عدالت میں قتل کا ایک مقدمہ آیا۔ قاتل کی طرف سے مسٹر محمد علی جناح وکیل تھے۔ قتل بہت زیادہ واضح تھا۔ تمام کارروائی اس طرح چل رہی تھی گویا قاتل کو سزا ہو کر رہے گی۔ مگر مسٹر جناح نہایت مطمئن تھے۔ وہ عدالت کی کارروائیوں میں بظاہر دلچسپی نہیں لے رہے تھے۔ قاتل اور اس کے ساتھیوں کو مسٹر جناح کے اوپر شبہ ہوا کہ وہ کسی وجہ سے کیس کی طرف سے غافل ہو گئے ہیں۔ اور قاتل کو سزا دلوا کر رہیں گے۔ مگر مسٹر جناح ہمیشہ یہی کہتے رہے کہ اطمینان رکھو، کچھ نہیں ہوگا۔

دن گزرتے رہے یہاں تک کہ قاتل کے لئے پھانسی کی سزا کا فیصلہ ہو گیا۔ مگر مسٹر جناح اب بھی مطمئن تھے۔ اس کے بعد اعلان ہوا کہ فلاں تاریخ کو اتنے بجے قاتل کو پھانسی دی جائے گی۔ مسٹر جناح بدستور مطمئن رہے یہاں تک کہ پھانسی کا وقت آ گیا۔

مسٹر جناح اپنے پورے وکیلانہ لباس کے ساتھ پھانسی گھر پہنچے اور نہایت خاموشی کے ساتھ پوری کارروائی دیکھتے رہے۔ جب آخری لمحہ آیا اور ہینگ مین نے رسی کا حلقہ قاتل کی گردن میں ڈالا تو مسٹر جناح فوراً بولے کہ بس۔ اس کے آگے اگر کچھ اور کیا تو تم سب لوگوں کو پھانسی پر چڑھا دوں گا۔

اب سارے لوگ حیران ہو گئے۔ مسٹر جناح نے کہا کہ جج نے اپنے فیصلہ میں جو الفاظ لکھے ہیں وہ یہ ہیں کہ اس کی گردن میں پھانسی دی جائے (He shall be hanged by the neck) اور ملزم کی گردن میں پھانسی کا پھندا ڈال لینے کے بعد ان الفاظ کی تعمیل ہو گئی، اب اس کے آگے آپ کچھ اور نہیں کر سکتے۔ اس وقت تک پھانسی کے ہندستانی قانون میں اتنے ہی الفاظ تھے۔ اس واقعہ کے بعد نیا قانون پاس کیا گیا جس میں یہ الفاظ لکھے گئے کہ ملزم کی گردن میں پھانسی دی جائے گی تاوقتیکہ وہ مر جائے:

He shall be hanged by the neck till he is dead

اس قسم کی لفظی موشگافیاں دنیا میں اکثر لوگوں کے لئے بہت مددگار ثابت ہوتی ہے۔ اس کے ذریعہ آدمی عدالت کی پکڑ سے بچ جاتا ہے۔ اس کے ذریعہ وہ اپنی گرتی ہوئی قیادت کو دوبارہ سنبھالنے میں کامیاب ہو جاتا ہے۔ اس کے ذریعہ وہ اپنے آپ کو کبھی غلط ثابت ہونے نہیں دیتا۔ اس کے ذریعہ وہ بڑے بڑے فائدے حاصل کرتا ہے مگر یہ سب کچھ صرف موجودہ دنیا کی حد تک ہے۔ آخرت میں اس قسم کی موشگافی کسی کے کچھ کام نہ آئے گی۔ کیوں کہ آخرت میں تمام فیصلے حقیقت کی بنیاد پر ہوں گے نہ کہ لفظی کرتب کی بنیاد پر۔

اختلاف کا سبب

احادیث سے ثابت ہوتا ہے کہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے اپنے بعد مسلمانوں کو سب سے زیادہ جس خطرہ سے ڈرایا تھا وہ آپس کا اختلاف تھا۔ یہ اندیشہ آج مسلمانوں کے بارہ میں پوری طرح صحیح ثابت ہوچکا ہے۔ یہ ایک حقیقت ہے کہ مسلمان آج کی دنیا کی واحد قوم ہیں جو سب سے زیادہ آپس میں لڑتے ہیں۔ جن کے درمیان سب سے زیادہ باہمی جھگڑا برپا رہتا ہے۔

مسلمانوں کے درمیان اس کمزوری کی ایک خاص نفسیاتی وجہ ہے، اور وہ ہے جھوٹا احساس برتری۔ مسلمان اپنے مخصوص عقائد کی وجہ سے ہمیشہ اُس وقت جھوٹے احساس برتری میں مبتلا ہوجاتے ہیں جب کہ خدا کا خوف ان کے دلوں سے نکل گیا ہو۔

مسلمان کا عقیدہ ایک طرف یہ ہوتا ہے کہ حق صرف وہ ہے جو اس کے پاس ہے۔ دوسری طرف اس کا عقیدہ اس کو یہ بھی بتاتا ہے کہ خدا ہی طاقت ور ہے، باقی سب لوگ عاجز ہیں۔ اس طرح مسلمان بیک وقت دو احساسات کے درمیان ہوتا ہے۔ بندوں کی نسبت سے سب سے بہتر ہونے کا احساس، اور خدا کی نسبت سے سب سے کم تر ہونے کا احساس "صرف میرے پاس حق ہے، میرے سوا کسی کے پاس حق نہیں" یہ عقیدہ عین اپنی فطرت کے مطابق آدمی کے اندر اپنی برتری کا احساس پیدا کرتا ہے۔ دوسری طرف یہ احساس کہ خدا ہی ہر چیز کا مالک ہے، میرے پاس اپنی کوئی چیز نہیں"، یہ احساس اس کے اندر عجز کا جذبہ ابھارتا ہے۔ اس طرح یہ دوسرا احساس پہلے احساس کو متوازن کرتا رہتا ہے۔ اپنے کو خیر امت سمجھتے ہوئے بھی آدمی دوسروں کے درمیان اس طرح رہتا ہے گویا اس کی کوئی حیثیت نہیں۔

مگر جب مسلمانوں کے اندر بگاڑ پیدا ہوتا ہے تو ان کے اندر سے جو چیز نکل جاتی ہے وہ یہی خدا کا ڈر ہے۔ اب مسلمان بے جان عقیدہ کے طور پر خدا کو مانتے ہیں۔ خدا کی عظمت اور کبریائی کے احساس سے ان کا دل خالی ہوچکا ہوتا ہے۔ یہی وہ خاص نفسیات ہے جو ان کے درمیان آپس کی لڑائی کو جنم دیتی ہے۔

سمندر کا پانی اگر اڑ جائے تو وہاں صرف نمک باقی رہے گا۔ اسی طرح "میں حق پر ہوں" کے احساس سے جب "میں عاجز ہوں" کا احساس نکل جائے تو اس کے بعد آدمی کے اندر جو چیز باقی رہے گی وہ صرف اپنی برتری کا جذبہ ہے۔ اور برتری کا جذبہ عجز سے خالی ہونے کے بعد ظلم اور فساد کے سوا کوئی اور چیز آدمی کے اندر پیدا نہیں کرتا۔

کیسے عجیب لوگ

نظام، خواہ اسلامی ہو یا غیر اسلامی اس کو قائم کرنے کے لئے ایسے افراد درکار ہوتے ہیں جن کے اندر حکمت اور کیرکٹر ہو۔ ایسے لوگ جن کے اندر نہ حکمت ہو اور نہ وہ کردار کی طاقت رکھتے ہوں وہ نہ اسلامی نظام قائم کر سکتے ہیں اور نہ غیر اسلامی نظام۔

۱۹۴۷ میں ہندستان آزاد ہوا تو جواہر لال نہرو ملک کے پہلے وزیر اعظم بنائے گئے۔ اس وقت صورت حال یہ تھی کہ ملک کے اکثر دانشور اور ماہرین یا تو انگریزوں کے وفادار رہے تھے یا ان کا ماضی کا ریکارڈ بنا رہا تھا کہ وہ کانگرس اور تحریک آزادی کے مخالف رہے ہیں۔ جواہر لال نہرو سے کسی نے اس صورت حال کا ذکر کیا اور کہا کہ ایسے لوگوں کے ذریعہ آپ کیوں کر اپنی حکومت چلائیں گے۔ نہرو نے جواب دیا:

"ہر آدمی کی ایک قیمت ہے اور میں وہ قیمت ادا کر سکتا ہوں"

چنانچہ نہرو نے لوگوں کو مختلف عہدے اور حیثیت دے کر نئی حکومت کا وفادار بنا لیا اور اس طرح کامیاب طور پر ملک کا انتظام چلاتے رہے۔

اب دوسری مثال لیجئے۔ ۱۹۸۰ میں آیات اللہ خمینی کو ایران میں اقتدار حاصل ہوا۔ اب ان کے سامنے بھی یہی مسئلہ تھا۔ کیوں کہ اس سے پہلے ایران میں رضا شاہ پہلوی کی حکومت تھی اور وہاں کا دانشور طبقہ شاہ کی وفاداری میں خمینی تحریک کا مخالف بنا ہوا تھا۔ امام خمینی کے سامنے یہ مسئلہ آیا تو انھوں نے کہا کہ "ہم ایسے تمام لوگوں کو مار ڈالیں گے"، چنانچہ انھوں نے ایک طرف سے ان تمام لوگوں کو قتل کرنا شروع کر دیا جنھوں نے انقلاب سے پہلے کوئی مخالفانہ رول ادا کیا تھا۔ امام آیات اللہ خمینی اپنے "مخالفین" کو ہلاک کرنے میں کامیاب ہو گئے مگر اس کا دوسرا نتیجہ یہ ہوا کہ ان کا اسلامی نظام بھی برباد ہو کر رہ گیا۔

۷ نومبر ۱۹۸۳ کو میری ملاقات ایک ایسے تعلیم یافتہ شخص سے ہوئی جو ۲۵ سال سے لندن میں رہتے ہیں اور اب انھوں نے وہیں کی شہریت اختیار کر لی ہے۔ میں نے ان سے پوچھا کہ برطانی قوم دوسری جنگ عظیم تک بہت بڑی شہنشاہیت کی مالک تھی۔ اب وہ تقریباً اپنے ملک تک محدود ہو کر رہ گئی ہے۔ پھر انھوں نے اپنی موجودہ حالت سے مطابقت پیدا کر لی ہے یا ابھی تک وہ اپنے ماضی کی عظمت میں جی رہے ہیں۔

انھوں نے جواب دیا کہ برطانی قوم نے اس معاملہ میں بڑی گہری ذہانت کا ثبوت دیا ہے۔

انھوں نے اپنی موجودہ صورت حال سے مطابقت کرلی ہے۔ مگر وہ مطابقت اس طرح ہے کہ اپنی عظمت کا احساس بدستور انھیں حاصل ہے، وہ اس سے محروم نہیں ہوئے۔ انھوں نے ایسا کیا ہے کہ انھوں نے برطانی عظمت کو مغربی عظمت میں تبدیل کر لیا ہے۔ وہ سمجھتے ہیں کہ جو بڑائی انھیں برطانیہ کی سطح پر حاصل نہیں ہے وہ آج بھی ان کو مغرب کی سطح پر حاصل ہے۔ ”جب ہم خود بھی اسی مغرب کا حصہ ہیں تو ہم کو پریشان ہونے کی کیا ضرورت“ برطانی قوم نے جب دیکھا کہ وہ اپنی عظمت کو انفرادی سطح پر قائم نہیں رکھ سکتے ہیں تو انھوں نے دوسروں کے ساتھ مل کر اپنی عظمت کو دوبارہ اجتماعی صورت میں حاصل کرلیا۔

دوسری طرف مسلم دنیا کا حال دیکھیے۔ پاکستان میں تقریباً ایک درجن بڑی بڑی اسلامی تنظیمیں اور جماعتیں ہیں۔ یہ تمام تنظیمیں اور جماعتیں پاکستان میں اسلامی نظام قائم کرنے کی علم بردار ہیں۔ پاکستان کی تاریخ میں کم ازکم دوبار ایسا ہوا ہے کہ یہ جماعتیں ”متحدہ محاذ“ بناکر ایک پلیٹ فارم پر جمع ہوگئی ہیں۔ پہلی بار صدر ایوب خاں کو حکومت کے عہدہ سے ہٹانے کے لئے اور دوسری بار ذوالفقار علی بھٹو کو ہٹانے کے لئے جو اس وقت وزیر اعظم کے عہدہ پر فائز تھے۔ دونوں بار یہ جماعتیں منفی مقصد میں کامیاب ہوگئیں۔ انھوں نے ایوب خاں کو بھی حکومت سے نکال دیا اور بھٹو کو بھی۔

مگر اس کے بعد جب وہ وقت آیا کہ پاکستان کی یہ اسلامی تنظیمیں اور جماعتیں مل کر اسلامی نظام قائم کریں اور ملک کو اسلامی تہذیب اور اسلامی سیاست کا نمونہ بنادیں تو تمام جماعتیں ایک دوسرے سے الگ ہوگئیں۔ اب ہر جماعت یہ چاہنے لگی کہ اس کو تنہا حکومت کی کرسی مل جائے۔ چونکہ یہ ممکن نہ تھا، ان میں سے کوئی بھی حکومت پر قبضہ کرنے میں کامیاب نہ ہوسکی۔ صدر ایوب کے ہٹنے کے بعد بھٹو نے حکومت پر قبضہ حاصل کرلیا اور وزیر اعظم بھٹو کے بعد جنرل ضیاء الحق نے۔

پاکستان کے ”اسلام پسند“ لیڈر اگر برطانیہ کے ”کفر پسند“ لیڈروں کی طرح ہوتے تو وہ اپنی قوم کے دوسرے ہم مذہبوں کی عظمت میں اپنی عظمت دیکھ لیتے۔ اور پھر ایک دوسرے سے مل جاتے نہ کہ الگ الگ ہوکر اپنے کو کمزور کرلیں۔ اس کا نتیجہ یہ ہوتا کہ پاکستان میں وہ اسلامی نظام عملاً قائم ہوچکا ہوتا جس کے لئے ابھی تک وہاں صرف پرجوش الفاظ بولے جارہے ہیں ——— جن لوگوں کے اندر کافرانہ نظام قائم کرنے کی بھی صلاحیت نہیں وہ اسلامی نظام قائم کرنے کا نعرہ لگا رہے ہیں۔ آسمان نے اس سے زیادہ عجیب منظر شاید کبھی نہیں دیکھا ہوگا۔

عورت کے بارہ میں

مغربی تہذیب کے مخصوص نظریات میں سے ایک نظریہ مرد اور عورت کی مساوات تھا۔ مغربی دنیا میں پچھلے سو سال سے اس نظریہ کا تجربہ کیا جا رہا ہے۔ مگر یہ تجربہ سراسر ناکام ثابت ہوا ہے۔ کسی بھی شعبہ میں یہ ممکن نہ ہو سکا کہ مرد اور عورت کو برابر کا درجہ دیا جا سکے۔ قانون کے اعتبار سے برابر کا درجہ پاتے کے باوجود عملی طور پر دونوں سماج کے اندر برابر کا مقام حاصل نہ کر سکے۔

اس فرق کے بارہ میں ابتدائً یہ کہا گیا کہ یہ فرق ماحول (Environment) کا پیدا کردہ ہے۔ مگر جدید تحقیقات اس مفروضہ کو سراسر بے بنیاد ثابت کر رہی ہیں۔ مختلف شعبوں میں تحقیقات نے ثابت کیا ہے کہ یہ فرق حیاتیاتی فرق کا نتیجہ ہے۔ یہ تمام تر پیدائشی ہے نہ کہ تاریخی۔

نیو یارک کے نیوز ویک (۱۸ مئی ۱۹۸۱) میں ایک مفصل رپورٹ شائع ہوئی ہے جس میں مختلف امریکی محققین کے نتائج تحقیق شائع ہوئے ہیں۔ ان میں مرد بھی ہیں اور عورتیں بھی۔ عورت اور مرد کی بناوٹ کا گہرا مطالعہ کرنے کے بعد محققین اس نتیجہ پر پہنچے ہیں کہ مرد کا مسائل کو حل کرنے میں زیادہ بہتر ثابت ہونا، عورتوں کا جذباتی طور پر سوچنا، لڑکیوں کے مقابلہ میں لڑکوں کا زیادہ بہادرانہ انداز سے کھیلنا، ریاضیات میں مردوں کا زیادہ برتر رہنا، یہ سب دونوں صنفوں کے درمیان حیاتیاتی فرق کا نتیجہ ہے نہ کہ محض ماحول کا۔

محققین کا خیال ہے کہ قائدانہ خصوصتیں (Leadership capacities) مردوں میں نسبتاً زیادہ ہوتی ہیں۔ جدید تحقیقات لوگوں کو اس عقیدہ کی طرف لے جا رہی ہیں کہ سابقہ خیال کے برعکس پرورش (Nurture) نہیں بلکہ فطرت (Nature) وہ اصل عامل ہے جس نے مرد اور عورت کے عمل میں فرق پیدا کیا ہے۔ عمومی طور پر تسلیم کر لیا گیا ہے کہ لڑنے بھڑنے کی صلاحیت عورتوں کے مقابلہ میں مردوں کے اندر زیادہ ہوتی ہے۔ محققین کا خیال ہے کہ دونوں کے ہارمون (Harmone) جدا جدا ہوتے ہیں اور وہی دونوں کے درمیان فرق پیدا کرنے میں اہم کردار ادا کرتے ہیں۔ کچھ محققین نے نر کے Harmone testosterone کو مادہ کے جسم میں داخل کیا تو مادہ کے اندر نر کی خصوصیات محسوس کی جانے لگیں۔ کچھ لڑکیوں میں پیدائش سے پہلے مردانہ ہارمون داخل کر دئے گئے۔ چنانچہ پایا گیا کہ پیدائش کے بعد ان میں گڑیوں سے کھیلنے کا شوق بہت کم تھا، ان میں لڑکوں کی طرح جارحیت کا مزاج زیادہ پایا گیا۔

محققین نے پایا ہے کہ ہارمون خود دماغ کے ڈھانچہ کو بدل دیتے ہیں۔ نر اور مادہ کے دماغ (Brain) میں فرق پایا گیا ہے اور اس کا سبب دونوں کے ہارمون کا فرق ہے۔ ان تحقیقات کے ذریعہ دونوں صنفوں کے درمیان ناقابل انکار فرق (Undeniable difference) موجود ہے۔

یہ تحقیقات واضح طور پر ثابت کر رہی ہیں کہ عورت اور مرد کی تخلیق میں فرق ہے اور جب دونوں میں فرق ہے تو دونوں کا دائرہ عمل الگ الگ ہونا چاہیے۔ مگر جو لوگ لمبی مدت تک پچھلے خیال کے ساتھ وابستہ رہے ہیں وہ ابھی اس کو ماننے کے لئے تیار نہیں۔ ایک مغربی عالم نے کہا:

> Whether these physiological differences destine men and women for separate roles in society is another and far more delicate question.

کیا یہ عضویاتی فرق مردوں اور عورتوں کے لئے سماج کے اندر الگ الگ کردار مقدر کرتے ہیں، یہ ایک علٰحدہ اور زیادہ پیچیدہ سوال ہے (ریڈرز ڈائجسٹ اکتوبر ۱۹۸۱)

اس سے پہلے امریکہ کے ایک اور ہفتہ وار میگزین ٹائم (۲۰ مارچ ۱۹۷۲) نے اس موضوع پر تفصیلی رپورٹ شائع کی تھی۔ میگزین کے وسیع ادارتی اسٹاف میں سے ۲۰ تعلیم یافتہ خواتین کو مقرر کیا گیا کہ وہ "جدید امریکہ میں عورتوں کی حالت" کا جائزہ لیں۔ انھوں نے ہر میدان میں اس کا جائزہ لیا اور ہر شعبہ کے ماہرین سے مدد لی۔ اس کے بعد انھوں نے ایک مفصل رپورٹ تیار کی جو خصوصی نمبر کے طور پر مذکورہ میگزین میں شائع ہوئی۔ راقم الحروف نے اس رپورٹ کا ایک خلاصہ اسی زمانہ میں الجمعیۃ ویکلی (۱۷ نومبر ۱۹۷۲) میں شائع کیا تھا۔

ٹائم کی اس رپورٹ میں بتایا گیا تھا کہ سو سالہ جدوجہد کے باوجود امریکی عورت ابھی تک اسی مقام پر ہے جہاں وہ سو سال پہلے تھی۔ مرد ابھی تک جدید امریکہ میں جنس غالب کی حیثیت رکھتا ہے۔ اس کی وجہ قدیم نظریہ کے مطابق، سماجی نہیں ہے بلکہ تمام تر حیاتیاتی اور نفسیاتی ہے۔ مغرب میں آزادی نسواں کی تحریک سو سالہ تجربہ کے بعد اب اس رائے پر پہنچی ہے کہ حیاتیاتی حقائق عورت کو مرد کے برابر مقام دینے میں رکاوٹ ہیں۔ یہ قدرت کا ظلم ہے نہ کہ سماج کا ظلم۔ اس لئے اب ان کا مطالبہ یہ ہے کہ سائنس آف ایوجینکس کے ذریعہ رحم مادر میں جینٹک کوڈ کو بدل دیا جائے اور اس طرح نیا حیاتیاتی نظام وجود میں لایا جائے جس میں نئے قسم کی عورتیں پیدا ہوں اور مردوں کی برتری ختم ہو کر یکساں صنفی صلاحیت کا سماج بن سکے ــــــ یہ تجویز اتنی عجیب و غریب ہے کہ اس پر مزید تبصرہ کی ضرورت نہیں۔

سماجی مظہر نہیں

نیوکلیر انرجی کو اگر آپ امریکہ کا سماجی مظہر (Social phenomenon) سمجھیں تو آپ کو نیوکلیر انرجی سے نفرت پیدا ہوجائے گی۔ کیوں کہ ایسی صورت میں نیوکلیر انرجی کے معنی آپ کے نزدیک یہ ہو جائیں گے کہ خطرناک بم بناؤ اور شہروں اور آبادیوں کو تباہ کرو۔ اس کے برعکس جب آپ نیوکلیر انرجی کو قدرتی مظہر (Natural phenomenon) سمجھتے ہیں تو آپ نیوکلیر انرجی کو الگ دیکھتے ہیں اور امریکہ یا کسی اور جنگی قوم کی طرف سے اس کے استعمال کو الگ۔ اب آپ ایٹم بم کو پسند نہیں کرتے مگر جہاں تک "ایٹمی" انرجی کا تعلق ہے اس سے آپ کی دل چسپی بدستور باقی رہتی ہے۔

نیوکلیر انرجی کے معاملہ میں کوئی شخص یہ غلطی نہیں کرتا کہ اس کو کسی جنگی قوم کا سماجی مظہر (Social phenomenon) سمجھے۔ مگر مذہب کا مطالعہ کرتے وقت کچھ لوگ یہی غلطی کرتے ہیں۔ مذہب اپنی حقیقت کے اعتبار سے ایک خدائی صداقت (Divine truth) ہے۔ مگر علم الانسان (Anthropology) میں مذہب کا مطالعہ اکثر ایک سماجی مظہر کے طور پر کیا جاتا ہے۔ اس کی وجہ سے مذہب کا تصور لوگوں کی نظر میں غلط ہو کر رہ گیا ہے۔ اس طرز مطالعہ کا سب سے بڑا نقصان یہ ہے کہ مطالعہ کرنے والے کے ذہن میں نظریہ اور عمل کا فرق باقی نہیں رہتا۔ مثال کے طور پر مسلمان قومیں جو کچھ عملاً کر رہی ہیں اسی کو آج کل کے بہت سے لوگوں نے اسلام سمجھ لیا ہے۔ یہی وہ طرز مطالعہ ہے جس نے موجودہ زمانہ میں اسلام کا خنجر (Dagger of Islam) اور محمد کی تلوار (Sword of Muhammad) جیسی کتابوں کو جنم دیا ہے۔ ان مصنفین نے یہ دیکھا کہ مسلمان خنجر اور تلوار کا استعمال کر رہے ہیں تو انھوں نے اپنے مخصوص تصور مذہب کی وجہ سے یہ سمجھ لیا کہ اسلام نام ہے تلوار اور خنجر کا۔

اس کے برعکس اسلام کو جب آپ ایک صداقت سمجھیں جو خدا کی طرف سے بھیجا گیا ہے اور قرآن اور سنت کے متن میں محفوظ ہے تو اسلام آپ کی نظر میں سماجی مظہر کا نام نہیں رہتا بلکہ ایک نظریہ کا نام بن جاتا ہے۔ اب آپ اسلام کو قرآن اور سنت کے متن کی روشنی میں دیکھتے ہیں نہ کہ مسلمانوں کے عمل کی روشنی میں۔

اسلام کو حقیقی طور پر سمجھنے کے لئے ضروری ہے کہ اس کو مسلمانوں سے الگ کرکے دیکھا جائے۔ اس کو سماجی مظہر سمجھنے کے بجائے ایک خدائی نظریہ سمجھا جائے۔ ایسی ہی صورت میں اسلام کو صحیح طور پر سمجھا جا سکتا ہے اور اس کے ساتھ انصاف کیا جا سکتا ہے۔

قانون کی حد

۲۶ اگست ۱۹۷۸ کو دہلی میں بھیانک جرم کا ایک واقعہ ہوا۔ ایک فوجی افسر ایم ایم چوپڑا کے دو بچے سنجے (۱۵) اور گیتا (۱۷) انتہائی بے قصور طور پر مار ڈالے گئے۔ نوجوان بہن بھائیوں کے اس قتل پر ملک کا ضمیر جاگ اٹھا۔ مجرمین کی تلاش شروع ہوئی۔ بالآخر قتل کے دونوں مجرمین جسبیر سنگھ عرف بلا (۲۵) اور کلجیت سنگھ عرف رنگا (۲۳) ایک ٹرین میں سفر کرتے ہوئے آگرہ اسٹیشن پر پکڑ لئے گئے اس کے بعد دونوں پر قتل کا مقدمہ چلا۔ لمبی عدالتی کارروائی کے بعد دونوں کو پھانسی دینے کا فیصلہ ہوا۔ مختلف قانونی مراحل سے گذر کر بالآخر دونوں کو ۳۱ جنوری ۱۹۸۲ کو دہلی کے تہاڑ جیل میں پھانسی دے دی گئی۔

اڈیشنل سیشن جج ایم۔ کے۔ چاولا نے پانچ صفحات کے فیصلہ میں دونوں کے لئے موت کا حکم دیتے ہوئے لکھا:

The ends of justice would be met only if the two accused were put to eternal sleep, thereby allowing others to live in peace

انصاف کے مقاصد صرف اسی طرح حاصل ہوسکتے ہیں کہ دونوں مجرم ہمیشہ کی نیند سلا دئے جائیں تاکہ دوسروں کو امن کے ساتھ جینے کا موقع ملے (ہندستان ٹائمس یکم فروری ۱۹۸۲)

جج کے یہ الفاظ انسانی قانون کی حد کو بہت اچھی طرح بتاتے ہیں۔ انسانی قانون کے بس میں صرف یہ ہے کہ وہ مجرم اور سماج کو ایک دوسرے سے جدا کر دے۔ وہ مجرم کو اس کے جرم کی حقیقی سزا نہیں دے سکتا۔ ایک شخص جب کسی معصوم جان کو ناحق ذبح کر دے تو یہ اتنا بڑا جرم ہے کہ موجودہ محدود دنیا کی کوئی بھی سزا اس کے جرم کے برابر نہیں ہوسکتی۔ دنیا کا جج بس اتنا ہی کر سکتا ہے کہ جس شخص کے اندر اس قسم کا مجرمانہ ذہن دیکھے اس کو آئندہ کے لئے سماج سے ہٹا دے۔

موجودہ دنیا کی یہ محدودیت تقاضا کرتی ہے کہ اس کے بعد ایک اور لامحدود دنیا آئے جہاں یہ کمی پوری ہو۔ جہاں کے جج کے امکان میں صرف یہ نہ ہو کہ وہ ظالم اور مظلوم میں جدائی کر دے بلکہ وہ ظالم کو اس کے ظلم کی ایسی سزا دے سکے جو انصاف کے تقاضے کو پورا کرنے والی ہو۔

اسلام اور عصر حاضر

حصہ اوّل

موجودہ زمانہ کے تمام انسانی مسائل ، براہ راست یا بالواسطہ طور پر صرف ایک چیز کا نتیجہ ہیں ـــــ خدا اور انسان کے درمیان جدائی۔ دور جدید نے انسان کو مادی ساز و سامان تو بہت دئے مگر اس کے خدا کو اس سے چھین لیا۔ اس طرح اس نے جدید انسان کے جسم کے لئے خوراک کا انتظام کیا اور روح کو فاقہ کی حالت میں چھوڑ دیا۔ روح کو اگر جسم سے کامل طور پر جدا کر دیں تو جسم کی موت واقع ہوجاتی ہے۔ اور اگر ایسا کریں کہ روح کی جو غذا ہے وہ اسے دینا بند کر دیں تو روح فاقہ کی حالت میں مبتلا ہوجاتی ہے۔ روح کے فاقہ سے روح پر وہ سب کچھ گذرنے لگتا ہے جو جسم کے فاقہ سے جسم پر گذرتا ہے۔ یہی وہ بات ہے جو قرآن میں ان لفظوں میں بیان ہوئی ہے: الا بذکر اللہ تطمئن القلوب (الرعد ۲۸)۔ یہی بات حضرت مسیح نے اپنے مخصوص انداز میں اس طرح بیان فرمائی: آدمی صرف روٹی ہی سے جیتا نہ رہے گا بلکہ ہر بات سے جو خدا کے منہ سے نکلتی ہے (متی ۴: ۴)

اسلام کے پاس آج کے انسان کو دینے کے لئے جو سب سے بڑی چیز ہے وہ یہی خدا کا عقیدہ ہے اگرچہ تمام مذاہب اصلاً خدا ہی کے مبلغ تھے۔ مگر بعد کے زمانہ میں وہ خدا کے تصور کو اپنی صحیح صورت میں محفوظ نہ رکھ سکے۔ کسی نے خدا کو اپنا قومی خدا بنا لیا۔ کسی نے اس میں شرک کی ملاوٹ کر دی۔ کسی نے خدا کو مجرد فلسفیانہ تخیل بنا کر رکھ دیا۔ اس طرح یہ مذاہب اس قابل نہ رہے کہ خدا کو اس کی واقعی حیثیت میں لوگوں کے سامنے پیش کر سکیں (یونس ۱۹) اب صرف اسلام ہی وہ دین ہے جس کے یہاں خدا کا تصور اپنی صحیح اور کامل صورت میں محفوظ ہے۔ اس لئے جدید انسان کو اس کا مطلوب خدا صرف اسلام کے یہاں مل سکتا ہے (آل عمران ۸۵)

روحانی فاقہ

جدید تہذیب نے انسان کو خدا سے محروم کر کے اس کو روحانی فاقہ میں مبتلا کر دیا ہے۔ اسی روحانی فاقہ کا نتیجہ ہے کہ موجودہ جاپان کے نوجوان، صنعتی ترقی کی انتہا پر پہنچ کر یہ کہنے لگے ہیں کہ "ہمارا کلچر ایک مرچنٹ کلچر ہے اور صرف مرچنٹ کلچر انسان کے لئے کافی نہیں"۔ مغربی سوسائٹی کا وہ مظہر جس کو ہپی ازم کہتے ہیں وہ بھی اسی فاقہ زدگی کی ایک مثال ہے۔

ایک ہپی نوجوان دہلی کی سڑک پر پیدل چل رہا تھا۔ اس کے جسم پر نہایت معمولی ہندستانی

لباس تھا اور گلے کے ساتھ لٹکتی ہوئی ایک چھوٹی سی ڈھول۔ نوجوان سے اس کا وطن پوچھا گیا تو اس نے بتایا کہ وہ کناڈا کا رہنے والا ہے۔ مزید سوالات کے دوران اس نے کہا: کناڈا میں میرے پاس ذاتی مکان اور ذاتی کار تھی۔ ایک اچھی بیوی تھی۔ معقول روزگار تھا۔ یہاں میرے پاس کوئی مکان نہیں جہاں بھی مجھے نیند آتی ہے میں سو جاتا ہوں، خواہ وہ ایک فٹ پاتھ ہو۔ میرے پاس اپنی سواری نہیں، روزگار نہیں۔ میری بیوی نے مجھے چھوڑ دیا ہے۔

"یہاں آپ کو جب اتنی تکلیف ہے تو پھر آپ نے کناڈا کو چھوڑ کر انڈیا آنا کیوں پسند کیا" اس کے جواب میں مغربی نوجوان نے نہایت سنجیدگی سے رک رک کر یہ الفاظ کہے: وہاں میں جسمانی طور پر مطمئن تھا، یہاں میں روحانی طور پر مطمئن ہوں:

There I was comfortable physically, here I am comfortable spiritually.

جدید تہذیب نے انسان کو بے شمار مادی چیزیں دیں۔ مگر یہ چیزیں اس کے وجود کے صرف "نصف حصہ" کو تسکین دے سکتی تھیں۔ بقیہ نصف کے لئے ان میں کوئی تسکین موجود نہیں تھی۔ جدید مشینی تہذیب کا یہی وہ تضاد ہے جس نے وہ تمام مظاہر پیدا کئے جن کو موجودہ زمانہ میں ہپی ازم، بورڈم، اَن رسٹ وغیرہ کہا جاتا ہے۔ اور جس کو پیس آف مائنڈ کو کھونا کہتے ہیں۔ یہاں مشہور ماہر نفسیات کارل ینگ (۱۹۶۱ - ۱۸۷۵) کا تجربہ قابل نقل ہے۔ انھوں نے کہا:

" پچھلے تیس برسوں میں روئے زمین کے تمام متمدن ممالک کے لوگوں نے مجھ سے (اپنے نفسیاتی امراض کے سلسلہ میں) مشورہ حاصل کرنے کے لئے رجوع کیا ہے۔ میرے مریضوں میں زندگی کے نصف آخر میں پہنچنے والے تمام لوگ جو کہ ۳۵ سال کے بعد کہی جاسکتی ہے، کوئی ایک شخص بھی ایسا نہیں تھا جس کا مسئلہ اپنے آخری تجزیہ میں زندگی کا مذہبی نقطۂ نظر پانے کے سوا کچھ اور ہو۔ یہ کہنا صحیح ہوگا کہ ان میں سے ہر شخص کی بیماری یہ تھی کہ اس نے وہ چیز کھو دی تھی جو کہ موجودہ مذاہب ہر دور میں اپنے پیروؤں کو دیتے رہے ہیں۔ اور ان مریضوں میں سے کوئی بھی حقیقتاً اس وقت تک شفایاب نہ ہو سکا جب تک اس نے اپنا مذہبی تصور دوبارہ نہیں پالیا"

Quoted by C.A. Coulson, *Science & Christian Belief*, p. 110

علیحدگی کا عمل

قدیم زمانہ میں انسانی ذہن پر فلسفہ کا غلبہ تھا۔ فلسفہ چیزوں کو مکمل طور پر سمجھنے پر زور دیتا تھا۔ وہ اشیاء کے ظاہر سے گذر کر اس کے باطن تک پہنچ جانا چاہتا تھا۔ تاہم پانچ ہزار سالہ کوشش کے باوجود فلسفہ کو اس مقصد میں کامیابی حاصل نہیں ہوئی۔

سولھویں صدی عیسوی میں جب یورپ میں سائنسی مطالعہ کا آغاز ہوا تو سائنس دانوں نے اس کو اپنے لئے مفید سمجھا کہ وہ چیزوں کی حقیقت کو اس کی خاصیت سے جدا کر دیں۔ انھوں کے علم کی دو قسمیں قرار دیں:

۱. چیزوں کا علم (Knowledge of Things)

۲. حقیقتوں کا علم (Knowledge of Truths)

انھوں نے اپنے مطالعہ کے دوران محسوس کیا کہ حقیقت کے بارہ میں قطعی علم تک پہنچنا ان کے لئے ممکن نہیں۔ کیوں کہ حقیقت ہمیشہ اتنی لطیف ہوتی ہے جس کو انسانی پیمانوں سے ناپا اور تولا نہیں جا سکتا (الاسرار ۸۵) چنانچہ انھوں نے عملی موقف اختیار کرتے ہوئے حقیقت کو اپنی تحقیق کے دائرہ سے باہر قرار دیا۔ انھوں نے کہا کہ ہم صرف "کیا" کے سوال کو لیں گے، ہم "کیوں" کے سوال پر غور نہیں کریں گے۔ اس طرح انھوں نے اپنی تحقیق کو صرف چیزوں کے علم تک محدود رکھا جس کا قطعی علم حاصل کیا جا سکتا تھا۔

یہ طرز فکر تاریخ میں کام کرتا رہا۔ اولاً گلیلیو (۱۶۵۰ - ۱۵۹۶) کے زمانہ میں پھول کی خوشبو کو پھول کی کیمسٹری سے جدا کیا گیا تھا۔ اس کے بعد ڈیکارٹ (۱۶۵۰ - ۱۵۹۶) نے ثنویت (Dualism) کے اس اصول کی توسیع کی اور اس کو انسان کے مطالعہ میں استعمال کیا۔ اس نے روح کو الگ کر کے جسم کا مطالعہ شروع کیا۔ انسان کے روحانی حصہ کو اس کے وجود کے مادی حصہ سے الگ کر دیا گیا۔

مذکورہ ثنویت سے مادی سائنس کے میدان میں بظاہر کوئی نقصان نہیں ہوا تھا۔ کیونکہ مقناطیس کے گرد مقناطیسی میدان (Magnetic Field) کی حقیقت کو سمجھے بغیر بھی یہ ممکن تھا کہ عملی طور پر مقناطیس کو بجلی پیدا کرنے اور موٹر چلانے کے لئے استعمال کیا جائے۔ مگر جب اس ثنویت کو انسان کے اوپر استعمال کیا گیا تو اس کے زبردست نقصانات ہوئے۔ کیوں کہ بے جان مادہ کی دنیا میں ثنویت چل سکتی ہے۔ مگر انسان ثنویت کو قبول نہیں کرتا۔ اس کی مثال ایسی ہے کہ کسی آدمی کا پتھر کا اسٹیچو ہو اور اس کو آپ ایک تاریک کوٹھری میں بند کر دیں تو اسٹیچو کے لئے کوئی مسئلہ پیدا نہیں ہوگا۔ مگر انسان ایک نفسیاتی وجود ہے۔ اس لئے اگر زندہ انسان کو اس قسم کی کوٹھری میں بند کیا جائے تو یہ اس آدمی کو ہلاک کرنے کے ہم معنی بن جاتا ہے۔ اسٹیچو کو آپ آزادی سے محروم کر سکتے ہیں اور وہ کوئی ردعمل ظاہر نہیں کرے گا۔ لیکن اگر انسان کو اس کی آزادی سے جدا کر دیں تو اس کی پوری شخصیت تہس نہس ہو جائے گی۔

مادہ کو اس کی معنویت سے اور جسم کو اس کی روح سے علیحدہ کرنے کا یہ معاملہ جو مغرب میں پیش

آیا اس نے وہ ذہنی زمین فراہم کردی جس میں خدا اور انسان کی وہ علیحدگی ممکن ہوسکے جو بعد کو مغرب میں پیش آئی۔

مسیحیت اور اسلام کا فرق

سائنسی تحقیق کا کام جب مسلم اسپین سے نکل کر اٹلی اور فرانس اور برطانیہ میں پہنچا اور وہاں اس کے لئے کام ہونے لگا تو جلد ہی ایک تیسرا فریق اس کی راہ میں رکاوٹ بن گیا جو اس سے پہلے نہیں ہوا تھا۔ یہ مسیحی چرچ تھا۔ مسیحیت جب فلسطین اور شام سے نکل کر یورپ میں داخل ہوئی تو اس کا سابقہ ارسطو کے افکار سے پیش آیا۔ چرچ نے اس کا مقابلہ کرنے کے بجائے خود اپنے علم کلام کو ارسطو کے منطقی نظام پر ڈھال لیا۔ حتیٰ کہ چند سو سال گذرنے کے بعد وہ ان کے یہاں مقدس بن گیا۔ بعد کو جب سائنسی تحقیقات نے بتایا کہ ارسطو کے افکار محض قیاسی اور بے بنیاد تھے، ان کا حقیقت واقعہ سے کوئی تعلق نہیں، تو چرچ نے محسوس کیا کہ اگر یہ نظریہ رائج ہوا تو اس کا عقائد کا نظام مشتبہ ہو جائے گا۔ اس نے اپنی غلطی کو ماننے کے بجائے طاقت کو استعمال کرنے کا فیصلہ کیا۔ اس زمانہ میں مسیحی چرچ کو یورپ میں زبردست اقتدار حاصل تھا۔ چنانچہ اس نے بزور جدید سائنس کو دبانا شروع کیا۔ تاہم بھیانک مظالم کے باوجود چرچ کو اس میں کامیابی نہ ہوسکی۔

پندرھویں صدی عیسوی سے پہلے کے زمانہ میں سائنس کا ارتقا مسلم دنیا میں ہوا۔ اس وقت اسپین اور دوسرے مسلم علاقے سائنسی تحقیقات کا مرکز تھے۔ اس زمانہ میں سائنس اور مذہب کے درمیان کوئی ٹکراؤ پیش نہیں آیا۔ کیوں کہ سچے مذہب اور سچے علم میں کوئی ٹکراؤ نہیں ہے۔ جس خدا نے دین کی وحی کی ہے، اسی نے اس کائنات کو بنایا ہے جس کی تحقیق سائنس کرتی ہے۔ پھر وحی اور علم میں ٹکراؤ کیوں کر ہوسکتا ہے۔ مگر بعد کے مرحلہ میں سائنس کا ارتقاء یورپ میں ہوا۔ یہاں مذہب کی نمائندگی کرنے کے لئے مسیحیت تھی جو تحریفات اور الحاقات کی بنا پر اپنی اصل ابتدائی شکل کھو چکی تھی۔ اسلام اور سائنس کے درمیان ٹکراؤ نہ ہونا اور مسیحیت اور سائنس کے درمیان زبردست ٹکراؤ ہو جانا، دونوں دینوں کے درمیان اسی فرق کا براہ راست نتیجہ ہے۔

اس معاملہ میں اسلام اور عیسائیت کے فرق کو سمجھنے کے لئے ایک تقابلی مثال لیجئے۔

زمین اور سورج کی گردش کے بارہ میں قدیم یونان میں دو نظریے پیش کئے گئے تھے۔ ایک ارسطو کا نظریہ، جس کا مطلب یہ تھا کہ زمین قائم ہے اور سورج اس کے گرد گھوم رہا ہے۔ دوسرا ارسٹارکس کا نظریہ، جس کے مطابق زمین سورج کے گرد گھوم رہی تھی۔

ارسطو کا مرکزیت زمین کا نظریہ (Geocentric theory) عیسائیوں میں بہت مقبول ہوا۔ اس نظریہ میں زمین کو بنیادی اہمیت حاصل ہو رہی تھی۔ اور چوں کہ انھوں نے حضرت مسیح کو خدائی کا مقام دے رکھا تھا اس لئے انھیں یہ بات زیادہ صحیح نظر آئی کہ وہی کرہ نظام شمسی کا مرکز ہے جہاں خداوند مسیح پیدا ہوئے ہوں۔ کوپرنیکس (۱۵۴۳ - ۱۴۷۳) نے جب مرکزیت آفتاب (Heliocentric Theory) کا اصول پیش کیا تو یورپ میں عیسائی پیشواؤں کو اقتدار حاصل تھا۔ انھوں نے اپنے عقیدہ کے تحفظ کے لئے کوپرنیکس کی زبان بند کر دی۔ خداوند کی جنم بھومی کو تابع (Satellite) قرار دینا ایک ایسا جرم تھا جس کو مسیحیت کبھی برداشت نہیں کر سکتی تھی۔

مگر یہ مسئلہ بگڑی ہوئی مسیحیت کا تھا نہ کہ حقیقی معنوں میں خدائی مذہب کا۔ چنانچہ مسلمان جو اس اعتقادی پیچیدگی میں مبتلا نہ تھے کہ پیغمبر کو خدا سمجھنے لگیں، انھوں نے مرکزیت آفتاب کے نظریہ کو زیادہ معقول پا کر اس کو قبول کر لیا۔ ان کے یہاں یہ سوال نہیں اٹھا کہ شمسی مرکزیت کا نظریہ مذہبی تعلیمات سے ٹکراتا ہے۔ پروفیسر برنس نے لکھا ہے:

> The Saracens were brilliant astronomers, mathmeticians, physicists, chemists, and physicians... despite their reverance for Aristotle, they did not hesitate to criticize his notion of a universe of concentric spheres with the earth at the centre, and they admitted the possibility that the earth rotates on its axis and revolves around the sun.— Edward Mc Nall Burns, *Western Civilizations*, W.W. Narton & Company Inc. N Y, p. 264

مسلمان فلکیات۔ ریاضی، طبیعیات، کیمیا اور طب میں نہایت باکمال عالم تھے۔ ارسطو کے احترام کے باوجود انھوں نے اس میں تامل نہیں کیا کہ وہ اس کے اس نظریہ پر تنقید کریں کہ زمین مرکز ہے اور سورج اس کے گرد گھوم رہا ہے۔ انھوں نے اس امکان کو تسلیم کیا کہ زمین اپنے محور پر گھومتی ہوئی سورج کے گرد گردش کر رہی ہے۔

مسیحیت میں تبدیلی

مسیحیت جب شام اور فلسطین سے نکل کر یورپ میں داخل ہوئی تو وہاں یونانی نظریات کا غلبہ تھا۔ مسیحی علماء نے یہاں تبلیغی مصلحت کی خاطر وہ عمل کیا جس کو قرآن میں مضاہاۃ (التوبہ ۳۰) کہا گیا ہے۔ انھوں نے مسیحیت کو لوگوں کے لئے قابل قبول بنانے کی خاطر اس کو مروجہ افکار کے مطابق ڈھالنا شروع کیا۔ اس زمانہ میں زیوس (Zeus) یونانیوں کا سب سے بڑا دیوتا تھا جس کو وہ خدا کا اکلوتا بیٹا سمجھتے تھے۔ اس کی نقل کرتے ہوئے وہ بھی حضرت مسیح کو خدا کا اکلوتا بیٹا کہنے لگے۔ اسی طرح اس زمانہ کے جغرافی اور طبیعی نظریات

کو بھی انھوں نے کتاب مقدس کی تفسیر کے طور پر لے لیا اور اس کو اپنی مذہبی کتابوں میں اس طرح درج کر لیا جیسے کہ وہ بھی آسمان سے اترے ہوں۔

مسیحیوں کی خوش قسمتی سے اسی زمانہ میں رومی بادشاہ قسطنطین نے مسیحیت قبول کر لی۔ وہ ۳۰۶ء سے لے کر ۳۳۷ء تک عظیم رومی سلطنت کا شہنشاہ رہا۔ اس نے اپنے شاہی اثرات کے تحت تمام یورپ میں مسیحیت پھیلادی۔ یہ لوگ جنھوں نے مسیحیت قبول کی انھوں نے کسی ذہنی اور فکری انقلاب کے ذریعہ مسیحیت نہیں قبول کی تھی بلکہ صرف حکومت کے زور پر قبول کی تھی۔ ان کا حقیقی ذہن اب بھی وہی رہا جو پہلے تھا۔ چنانچہ انھوں نے مسیحیت کو اپنے سابقہ خیالات کے مطابق ڈھالنا شروع کیا۔ اس طرح بالآخر نوبت یہاں تک پہنچی کہ مسیحیت کے نام سے ایک ایسا مذہب وجود میں آگیا جس کا حضرت مسیح کی انجیل سے بہت کم تعلق تھا۔ یہ گویا رومی اور یونانی مذہب تھا جس کو مسیحیت کا نام دے کر اختیار کر لیا گیا۔ اڈولف ہارنک نے صحیح لکھا ہے کہ چوتھی صدی تک انجیل یونانی فلسفہ کے رنگ میں رنگ چکی تھی:

By the fourth century the living gospel had been masked in Greek philosophy

مذہب میں جب کوئی چیز عرصہ تک جاری رہے تو وہ مقدس بن جاتی ہے۔ چنانچہ یہ بدلی ہوئی مسیحیت چند سو سال کے بعد مقدس بن گئی۔ جو چیز ابتداءً مصلحت کے تحت اختیار کی گئی تھی وہ مسیحیت کا حقیقی حصہ سمجھی جانے لگی۔ حتی کہ یونانیوں کے بے اصل علوم مسیحی علوم کہے جانے لگے۔ مثلاً مسیحی جغرافیہ (Topography Christian) وغیرہ۔

Adalf Harmack, Outline of the History of Dogma.

مذہب اور زندگی کی علیحدگی

مسلمانوں کے زوال کے بعد جب یورپ میں جدید تحقیق کا کام شروع ہوا تو "مسیحی علوم" کی غلطی واضح ہونے لگی۔ جدید علماء نے جب فلکیات اور جغرافیہ اور طبیعیات سے متعلق اپنی تحقیقات شائع کیں تو مذہبی حلقوں میں کھلبلی مچ گئی۔ مسیحی چرچ نے اولاً ان علماء کی بے دینی کے فتوے دئے۔ جب اس سے لوگوں کی زبانیں بند نہیں ہوئیں تو پوپ کے حکم خاص سے احتساب کی عدالت (Inquisition) قائم ہوئی۔ اندازہ ہے کہ تقریباً تین لاکھ آدمیوں کو مسیحی احتساب کی عدالت میں کھڑا ہونا پڑا۔ ان کو سخت سزائیں دی گئیں۔ تقریباً ۳۰ ہزار آدمیوں کو زندہ جلا دیا گیا۔ ان سزا یافتگان میں گلیلیو اور برونو (Brunoe) جیسے لوگ بھی شامل تھے۔

اس کے نتیجہ میں چرچ اور سائنس کے درمیان جنگ شروع ہوئی جو بالآخر علم اور مذہب کی جنگ

بن گئے۔ مفروضہ مقدس عقائد پر بے جا اصرار کا نتیجہ یہ ہوا کہ لوگوں میں یہ خیال عام ہو گیا کہ علم اور مذہب دونوں ایک دوسرے کے ضد ہیں۔ ایک کی ترقی دوسرے کے لئے موت کا حکم رکھتی ہے۔ قرآن کے مطابق علم اللہ سے قریب کرنے والی چیز ہے (فاطر ۲۸) مگر مسیحی تحریفات کا نتیجہ یہ ہوا کہ علم لوگوں کو اللہ سے دور کرنے والا بن گیا۔

علم اور مذہب کا یہ تصادم تقریباً دو سو برس تک جاری رہا۔ یہاں تک ۱۸۵۹ میں چارلس ڈارون نے اپنی کتاب (Origin of Species) شائع کی۔ چرچ نے اس کی زبردست مخالفت کی۔ مگر اب چرچ کا زور گھٹ چکا تھا۔ بالآخر دونوں کے درمیان (Secularism) کی صورت میں سمجھوتہ ہو گیا۔ مذہب اور علم کے دائرے ایک دوسرے سے الگ کر دئے گئے۔ مذہب کو شخصی دائرہ کی چیز قرار دے کر بقیہ تمام شعبوں میں انسان کے لئے آزادی کا حق تسلیم کر لیا گیا کہ وہ جو چاہے کرے اور جس طرح چاہے اپنی تحقیق چلائے۔

مذہب ایک رسمی ضمیمہ

تاہم یہ علٰحدگی محض علم اور مذہب کی علٰحدگی نہ تھی بلکہ یہ زندگی اور مذہب کی علٰحدگی تھی۔ چرچ نے یہ نہیں کیا کہ جن غیر آسمانی افکار و خیالات کو اس نے اپنے مذہب میں شامل کیا تھا ان کو وہ اپنے مذہب سے خارج کر دے۔ ان کی ساری نامعقولیت کے باوجود وہ ان کو اپنے مذہب کا جزء بنائے رہا۔ ایسی حالت میں مذہب کو شخصی دائرہ میں جگہ ملنا بھی ناممکن تھا۔ کیوں کہ آدمی ایک سوچنے سمجھنے والی مخلوق ہے۔ جس چیز کی معنویت آدمی کے اوپر واضح نہ ہو اس کو وہ شخصی طور پر بھی اپنی زندگی کا جزء نہیں بنا سکتا۔ اس تقسیم کا لازمی نتیجہ یہ ہونا تھا کہ مذہب زندگی کا صرف ایک رسمی ضمیمہ بن جائے، وہ کسی کی زندگی میں حقیقی طور پر شامل نہ ہو سکے۔

قرآن میں ارشاد ہوا ہے کہ خدا نے کسی آدمی کے سینے میں دو دل نہیں بنائے (الاحزاب ۴) یعنی یہ انسانی فطرت کے خلاف ہے کہ دو غیر ہم آہنگ فکر یکساں قوت کے ساتھ آدمی کے ذہن میں جمع ہوں۔ جو چیز علمی اور فکری معیار پر پوری نہ اترے وہ کسی شخص کی زندگی کا ایک غیر موثر ضمیمہ تو بن سکتی ہے مگر وہ ایک زندہ عنصر کی حیثیت سے کبھی اس کی زندگی میں جگہ نہیں پا سکتی۔ مذہب کو شخصی طور باقی رکھنے کے لئے بھی اس کا مطابق عقل ہونا ضروری ہے۔ جو مذہب عقل کے مطابق نہ ہو وہ شخصی سطح پر بھی اپنے وجود کو باقی رکھنے میں کامیاب نہیں ہوگا۔ ایسا مذہب کسی آدمی کے ہاتھ میں بس "چھنگلیا" بن کر رہ جائے گا۔ وہ اس کے ہاتھ کا "انگوٹھا" نہیں بن سکتا۔

فطرت انسانی کا تقاضا

جسم اور روح کی علیحدگی اور اس کے بعد خدا کو انسانی زندگی سے جدا کرنے کے نتیجہ میں تاریخ میں پہلی بار انسان کے سامنے یہ مسئلہ آیا ہے کہ سامان حیات کی افراط کے درمیان انسان احساس محرومی سے دوچار ہے۔ آج انسان کی صورت میں ہمارے سامنے ایک ایسا وجود ہے جس کو سب کچھ فراہم کرنے کے بعد بھی اس کے چہرے پر حقیقی خوشی دیکھنا ہمارے لیے مقدر نہیں۔ برٹرینڈ رسل (۱۹۷۰ - ۱۸۷۲) اپنی کتاب (The Conquest of Happiness) کا آغاز ان الفاظ میں کرتا ہے کہ جانور اس وقت تک خوش رہتے ہیں جب تک وہ صحت مند ہوں اور انھیں خوراک حاصل ہو۔ انسان کو بھی ایسا ہی ہونا چاہئے۔ مگر جدید دنیا میں انسان خوش نہیں، کم از کم اکثریت کا حال یہی ہے:

> Animals are happy so long as they have health and enough to eat. Human beings, one feels, ought to be, but in the modern world they are not, at least in a great majority of cases.

اس کی وجہ یہ ہے کہ جدید تہذیب نے اپنی عظیم کامیابیوں کے باوجود انسان کی طلب کا صرف نصف حصہ فراہم کیا ہے اس نے "جسم" کے تقاضے فراہم کیے۔ مگر وہ "روح" کے تقاضے فراہم کرنے میں ناکام رہی۔

انسان معنویت چاہتا ہے اور جدید تہذیب اس کو صرف پتھر کا ایک ٹکڑا دیتی ہے۔ انسان زندگی چاہتا ہے اور جدید تہذیب اس کو انسان کی صورت میں ایک اسٹیچو فراہم کرتی ہے۔ انسان قلب و دماغ کی تسکین چاہتا ہے اور جدید تہذیب اس کو مشین کی بے روح گاڑی میں بٹھا کر چھوڑ دیتی ہے۔ انسان خالق کائنات سے ملنا چاہتا ہے اور سائنس اس کو مخلوق تک پہنچا کر اپنی سواری سے اتار دیتی ہے۔ انسان چاہتا ہے کہ اپنے محسن کو سجدہ کرے۔ مگر سائنس نے جو دنیا بنائی ہے اس میں اس کو کہیں اپنا محسن نظر نہیں آتا۔ حتیٰ کہ وہ حقیقی خدا کو نہ پاکر مفروضہ خداؤں کے آگے جھکنے لگتا ہے۔ مگر یہ ویسا ہی ہے جیسے کسی ماں کے یہاں اولاد نہ ہو تو وہ پلاسٹک کی گڑیا لے کر اپنی گود میں دبالے۔ دوسرے تمام معبود قرآن کے الفاظ میں اسماء (یوسف ۴۰) ہیں نہ کہ حقیقتیں۔

انسان کے لئے ایک برتر خدا کی ضرورت اتنی مسلم ہے کہ وہ مفکرین بھی اس کی اہمیت تسلیم کرتے ہیں جو اپنے ذوق کے مطابق خدا اور مذہب کو ماننا پسند نہیں کرتے۔ مثال کے طور پر برٹرینڈ رسل نے لکھا ہے کہ اگر زندگی کو پورے معنوں میں انسانی زندگی بننا ہے تو اس کا کوئی مقصد ہونا چاہیے جو خود انسانی زندگی سے باہر ہو۔ ایسا مقصد جو غیر شخصی ہو اور انسانیت سے بلند تر ہو۔ مثلاً خدا، صداقت یا حسن:

If life is to be fully human it must serve some end which seems in some sense, outside human life, some end which is impersonal and above mankind, such as God or truth or beauty.
Bertrand Russell, *Principles of Social Reconstruction*,
London, George Allen & Unwin Ltd. 1923, P. 215

یہ ایک منکر خدا کی زبان سے خدا کی فطری ضرورت کا اقرار ہے۔ دورِ جدید کے انسان کی محرومی یہ ہے کہ اس نے اپنے خدا کو کھو دیا ہے۔ اب اس کی نجات صرف اس میں ہے کہ دوبارہ وہ اپنے خدا کو پالے۔

علم الانسان کے ماہرین نے مختلف انسانی معاشروں کا مطالعہ کیا ہے۔ کئی ہزار سال کے تاریخی ریکارڈ کو سامنے رکھ کر انھوں نے انسان کی فطرت کو سمجھنے کی کوشش کی ہے۔ ان کا متفقہ بیان ہے کہ انسان کی فطرت میں خدا کا تصور پیوست (Interwoven) ہے جس طرح بکری سے گھاس اور بلی سے گوشت کھانے کی جبلت کو ختم نہیں کیا جا سکتا۔ اسی طرح خدا کو انسانی فطرت سے جدا نہیں کیا جا سکتا۔

موجودہ زمانہ میں اس کی ایک مثال کمیونسٹ سوسائٹی ہے۔ روس میں کمیونسٹ انقلاب ۱۹۱۷ میں آیا۔ اس کے بعد روسی معاشرہ سے خدا کو نکال دیا گیا۔ تعلیم و تربیت کے تمام شعبے انکارِ خدا کی بنیاد پر قائم کئے گئے۔ مگر روس کی جدید نسل جو مکمل طور پر بے خدا نظام میں پیدا ہوئی ہے اور بے خدا تعلیم و تربیت کے تحت پلی اور بڑھی ہے، اس کے اندر بھی خدا کا شعور نہایت گہرائی کے ساتھ پیوست ہے۔

۱۹۷۳ کا واقعہ ہے۔ ایک روسی جہاز (Ilyushin Jet) ہندستان کی مشرقی سرحد پر اڑ رہا تھا کہ اس کا انجن خراب ہو گیا اور وہ بنگال میں گر پڑا۔ بعد کو جب جہاز کی دم سے (Black Box) نکالا گیا اور اس کو (Replay) کیا گیا تو معلوم ہوا کہ آخری لمحات میں نوجوان روسی پائلٹ کی زبان سے جو لفظ نکلا وہ یہ تھا کہ پیٹر ہم کو بچا:

Peter save us.

عجز کی تلافی

انسان کی زندگی کچھ اس ڈھنگ پر بنی ہے کہ وہ مستقل طور پر عجز (Helplessness) کے احساس میں مبتلا رہتا ہے۔ اس سے کوئی بھی شخص مستثنیٰ نہیں خواہ وہ عالم ہو یا جاہل، امیر ہو یا غریب، بڑا ہو یا چھوٹا۔

آدمی جسمانی اعتبار سے اتنا کمزور ہے کہ ایک معمولی حادثہ بھی اس کو زخمی کر دینے کے لئے کافی ہے۔ اس کو زندہ رہنے کے لئے ایک بے حد متوازن جغرافیہ درکار ہے۔ جغرافی توازن میں بگاڑ کو وہ برداشت

نہیں کر پاتا۔ وہ جس کائنات میں ہے وہ اتنی زیادہ بڑی اور وسیع ہے کہ اس کے مقابلہ میں انسان اپنے آپ کو حد درجہ حقیر پاتا ہے۔ کوئی شخص علمی میدان میں تحقیق کر رہا ہو تو اس پر کھلتا ہے کہ حقائق اس سے زیادہ وسیع اور پیچیدہ ہیں کہ اس کی محدود عقل ان کا احاطہ کر سکے۔ ایک آدمی جب کوئی کام کرتا ہے تو اس کو تجربہ ہوتا ہے کہ اکثر اوقات لامعلوم اسباب (Unknown Factors) حائل ہو کر اس کے کام کو بگاڑ دیتے ہیں۔ اور اگر بالفرض کوئی خوش قسمت آدمی ان تلخ تجربات سے بچ جائے تو موت سے وہ اپنے آپ کو نہیں بچا پاتا۔ موت کا حملہ بالکل یک طرفہ ہوتا ہے۔ موت آدمی کے گھروندہ کو اس طرح تہس نہس کر دیتی ہے جیسے ایک سخت زلزلہ کسی پر رونق شہر کو اچانک ملبہ کا ڈھیر بنا دے۔

یہ احساس عجز ہر آدمی کا پیچھا کر رہا ہے۔ یہ چیز اس کو مجبور کرتی ہے کہ وہ ایک ایسا سہارا پکڑے جو اس سے زیادہ طاقت ور ہو۔ جو اس کے لئے اس کے عجز کی تلافی بن جائے۔ یہی احساس بے چارگی آدمی کو خدا کی طرف لے جاتا ہے۔ آدمی کو ایک ایسا خدا چاہئے جس کے سامنے وہ اپنے جذبات شکر کو انڈیل سکے۔ جس کے اوپر وہ اپنے معاملات میں بھروسہ کرے۔ جس کا عقیدہ اس کے لئے اس وقت بھی سہارا بنا رہے جب کہ بظاہر کوئی سہارا نہیں ہوتا۔ جس سے وہ یہ امید کر سکے کہ وہ اس کی ہر بربادی کے بعد اس کو آباد کرے گا۔ اور ہر مشکل کو اس سے رفع فرمائے گا۔ اسلام کا خدا ایسی ہی ایک ہستی ہے جو پورے معنوں میں حقیقی ہے اور اسی کے ساتھ کامل بھی۔

خدا کا تصور مختلف مذاہب میں

آدمی کا یہ احساس عجز اس وقت تک تسکین نہیں پاتا جب تک اس کو "خدا" فراہم نہ کر دیا جائے۔ بظاہر ہر مذہب انسان کو یہی خدا فراہم کر رہا ہے۔ مگر اسلام کے سوا جو مذاہب ہیں وہ سب تحریف اور الحاق اور ضیاع کا شکار ہوتے رہے ہیں۔ چنانچہ خدا کا تصور ان کے یہاں اپنی صحیح شکل میں باقی نہیں رہا ہے۔ اس لئے وہ خدا تو پیش کرتے ہیں مگر وہ ایسا خدا پیش کرتے ہیں جو واقعہ کے مطابق نہ ہونے کی وجہ سے انسان کو پوری تسکین نہ دے سکے۔

کیٹ اسٹیونس (Cat Stevens) بین اقوامی شہرت رکھنے والے پاپ موسیقی کے ماہر تھے۔ انھوں نے ۱۹۷۶ میں مسیحی مذہب کو چھوڑ کر اسلام قبول کر لیا۔ ان کا موجودہ نام یوسف اسلام ہے۔ انھوں نے اپنے قبول اسلام کی کہانی بتاتے ہوئے کہا کہ مسیحی چرچ ہم کو خدا پر عقیدہ رکھنے کی تلقین کرتا ہے۔ مگر خدا سے مربوط ہونے کا مسیحی طریقہ صرف حضرت عیسیٰ کی معرفت ممکن ہے۔ کوئی آدمی خدا سے براہ راست ربط قائم نہیں کر سکتا۔ انھوں نے کہا کہ اسلام کی اہمیت یہ ہے کہ وہ آدمی کو ایسے خدا سے متعارف کرتا ہے جو براہ راست

اپنے بندوں سے باتیں کرتا ہے اور اس کی روح سے اتصال قائم کرتا ہے۔ اسلام میں ہر آدمی براہ راست اپنا ربط خدا سے قائم کرسکتا ہے۔

Monthly Arabia, London, July 1983

انسان کی فطرت ایک ایسا خدا چاہتی ہے جس سے وہ براہ راست مربوط ہو سکے۔ مگر موجودہ مذاہب اس کو ایسا خدا دیتے ہیں جس سے وہ صرف بالواسطہ طور پر مربوط ہو سکتا ہے۔ تمام مذاہب میں صرف اسلام ہے جو انسان کو براہ راست خدا سے ملاتا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اسلام آج بھی اپنی اصل الہامی شکل میں باقی ہے۔ جب کہ دوسرے مذاہب انسانی ملاوٹ کی وجہ سے اپنی اصل الہامی صورت کو کھو چکے ہیں۔

تمام مذاہب اصلاً ایک تھے۔ مگر اب ان میں انسانی آمیزش کی وجہ سے فرق ہو گیا ہے (یونس ۱۹) کوئی مذہب ایسا ہے جو کئی خدا پیش کر رہا ہے۔ مگر یہ انسانی طلب کے سراسر غیر مطابق ہے۔ کیوں کہ خدا کی طلب ایک ایسی ہستی کی طلب ہے جس کو آدمی اپنا مرکز توجہ بنا سکے۔ اور مرکز توجہ ہمیشہ کوئی ایک چیز بنتی ہے نہ کہ کئی چیز۔ کوئی مذہب کسی انسان کو خدا کے روپ میں پیش کرتا ہے۔ مگر انسان کو جس خدا کی تلاش ہے وہ وہی خدا ہو سکتا ہے جو اس کی اپنی ذات سے برتر ہو، ایسا خدا انسان کا معبود نہیں بن سکتا جو خود اس کے اپنے جیسا ہو۔ کوئی مذہب خدا کو محض ایک روح مجرد (Vague Spirit) کی صورت میں پیش کر رہا ہے۔ مگر انسان ایک دیکھنے اور سننے اور بولنے والے خدا کو چاہتا ہے۔ ایتھر یا قوت کشش جیسی کوئی مجرد چیز اس کی مانگ کو پورا نہیں کرسکتی۔

مشہور مفکر آرتھر کوسلر کو عزت اور مرتبہ حاصل تھا۔ اس کے پاس تقریباً چار لاکھ پونڈ نقد موجود تھے۔ مگر تین شادیوں کے باوجود وہ بے اولاد تھا۔ نیز رعشہ اور خون کے کینسر نے اس کو سخت پریشان کر رکھا تھا۔ چنانچہ اس نے مایوسی کے عالم میں مارچ ۱۹۸۳ میں اپنے لندن کے مکان میں خودکشی کر لی۔ اس وقت اس کی عمر ۷۷ سال تھی۔

اسی طرح ہر روز دنیا بھر میں سیکڑوں آدمی خودکشی کرتے رہتے ہیں۔ خودکشی کے ان واقعات کی وجہ ہوتی ہے ——— موجودہ دنیا میں اپنی آرزوؤں کی تکمیل سے مایوسی۔ مگر تاریخ میں کبھی ایسا نہیں ہوا کہ خدا پر سچا عقیدہ رکھنے والوں نے کبھی خودکشی کی ہو۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ خدا کا عقیدہ آدمی کو موجودہ دنیا کے بعد آنے والی دوسری دنیا میں امید عطا کرتا ہے۔ کیوں کہ خدا کی اسکیم میں زندگی صرف موجودہ دنیا کی زندگی نہیں ہے۔ وہ موت کے بعد بھی جاری رہتی ہے۔ خدا پر یقین رکھنے والے کو اگر دنیا میں کوئی تکلیف پہنچتی ہے تو وہ آئندہ زندگی کے ساتھ لو لگا لیتا ہے۔ وہ انسانوں کی دنیا سے مایوس ہو کر خدا کی دنیا

کو اپنی توجہ کا مرکز بنالیتا ہے۔ اس طرح سچے خدا پرست کی تمام پریشانیاں ایک صحت مند رجائیت (Healthy Optimism) میں تبدیل ہو جاتی ہیں۔

خدا کا بگڑا ہوا تصور

دوسرے مذاہب میں خدا کا جو بگڑا ہوا تصور پایا جاتا ہے وہ انسان کی طلب کا مکمل جواب نہیں بنتا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ انسان کی نفسیات ایک کامل خدا کی طالب ہے اور یہ مذاہب اس کو ناقص خدا کی صورت میں پیش کرتے ہیں۔ اس بنا پر اگرچہ ایسا ہوتا ہے کہ اندرونی طلب سے مجبور ہو کر بہت سے لوگ اس کی طرف لپک پڑتے ہیں۔ مگر ان کی حقیقی روحانی تسکین اسی خدا سے ہو سکتی ہے جس کا تصور اسلام میں پیش کیا گیا ہے۔ ایک شخص اپنی سواری کے لئے موٹر کار کا طالب ہو تو آپ اس کو کھلونا گاڑی (Toy Car) دے کر مطمئن نہیں کر سکتے۔ اس کا اطمینان تو اسی وقت ہو سکتا ہے جب کہ اس کو ایک واقعی کار مل جائے۔ اسی لئے قرآن میں کہا گیا ہے الا بذکر اللہ تطمئن القلوب (سنو خدا کی یاد ہی سے دلوں کو اطمینان ہوتا ہے)

خدا اگرچہ ہمارے سامنے نہیں ہے مگر اس کی تخلیق، ایک عظیم کائنات کی صورت میں ہمارے چاروں طرف پھیلی ہوئی ہے۔ ہم اس کو دیکھتے ہیں اور اس کا تجربہ کرتے ہیں۔ ایسی حالت میں انسان کا ذہن کسی ایسے خدا پر ہی مطمئن ہو سکتا ہے جو موجودہ کائنات کے شایان شان ہو۔ جو آدمی کو واقعی اس عظیم کائنات کا خالق دکھائی دے۔ اس سے کم تر درجہ کا خدا انسان کے ذہن کو اپیل نہیں کر سکتا۔

ایک امریکی سائنس داں والٹر آسکر لنڈبرگ نے اس کی ایک دل چسپ مثال دی ہے۔ وہ لکھتے ہیں کہ "ایک سائنس داں دوسروں کے مقابلہ میں ایک خصوصی موقع (Special Advantage) اس بات کا رکھتا ہے کہ وہ خدا کی سچائی کو سمجھ سکے۔ وہ اساسی اصول جس پر اس کے کام کی بنیاد ہے وہ دراصل خدا کے وجود کا ایک اظہار (An expression of God's existence) ہے" اس کے باوجود سائنس کی تعلیم کے بعد کیوں لوگ خدا کے منکر ہو جاتے ہیں۔ امریکی پروفیسر کے نزدیک، دو میں سے ایک خاص سبب اس کا یہ ہے کہ منظم مسیحیت میں نوجوانوں کے اندر گہرائی کے ساتھ ایک ایسے خدا کا عقیدہ پیوست ہے جو انسانی صورت میں پیدا ہوا نہ کہ ایسا انسان جو خدا کی صورت میں پیدا ہوا۔ اس طرح کے ذہن بعد کو جب سائنس کی تعلیم حاصل کرتے ہیں تو خدا کا یہ الٹا اور محدود تصور دھیرے دھیرے غیر عقلی اور غیر علمی معلوم ہونے لگتا ہے۔ بالآخر جب مطابقت پیدا کرنے کی تمام کوششیں ناکام ہو جاتی ہیں تو اس کے بعد خدا کا یہ تصور مکمل طور پر چھوڑ دیا جاتا ہے۔"

> In organised Christianity there is instilled deeply in young people a concept of God created in the image of man, rather than of man created in the image of God. When such minds are later trained in science, this reversed and limited anthropomorphic concept gradually becomes more and more incompatible with the rational, inductive attitude of Science. Ultimately when all attempts at reconciliation fail, the concept of God may be abandoned entirely.
>
> • *The Evidence of God in an Expanding Universe*, p. 56

اسلام کوئی نیا دین نہیں ہے۔ اصلاً اور ابتداءً دوسرے مذاہب اور اسلام ایک ہی تھے۔ مگر دوسرے مذاہب میں تبدیلیوں کی وجہ سے صحیح تصور خدا محفوظ نہ رہ سکا۔ جب کہ اسلام میں خدا کا تصور اپنی اصلی اور حقیقی صورت میں محفوظ ہے۔ یہی وجہ ہے کہ وہ خدا کو صحیح ترین روپ میں پیش کرتا ہے۔ اسلام کا خدا ایک خدا ہے۔ وہ ہر قسم کی طاقتوں کا مالک ہے۔ وہ ہمیشہ سے ہے اور ہمیشہ رہے گا۔ اس کا کوئی شریک نہیں۔ اس نے تنہا پوری کائنات کو پیدا کیا اور وہی تنہا پوری کائنات کو سنبھالے ہوئے ہے۔ وہ دیکھتا ہے اور سنتا ہے اور بولتا ہے۔ وہ آدمی کی پکار پر ہر وقت اس کا ساتھ دینے کے لئے موجود رہتا ہے۔ اس سے ہر وقت اور ہر مقام پر انسان کا ربط قائم ہوسکتا ہے۔ ہر چیز اس کے قبضۂ اختیار میں ہے۔ وہ موت سے پہلے کے مرحلہ میں بھی آدمی کا مددگار ہے اور موت کے بعد کے مرحلہ میں بھی ـــــــ قرآن اسی خدا کا ایک تعارف ہے جس کو خدا کا کامل تعارف حاصل کرنا ہو اس کو قرآن پڑھنا چاہئے۔

حصہ دوم

موجودہ زمانہ میں تمام قومیں اجتماعی مسائل سے دوچار ہیں۔ ترقی یافتہ ممالک ہوں یا غیر ترقی یافتہ ممالک، ہر جگہ انسانی معاشرہ ظلم وفساد کا شکار ہے۔ ہر جگہ یہ سوال درپیش ہے کہ معاشرہ کی تنظیم کس طرح کی جائے کہ وہ بہتر انسانی معاشرہ بن سکے۔

انسانی مسائل پر غور کرتے ہوئے سب سے اہم بات جو سامنے آتی ہے وہ یہ کہ انسان ایک ایسی دنیا میں اپنے مسائل کا حل تلاش کرنے کے سوال سے دوچار ہے جہاں بقیہ تمام چیزوں کے مسائل اول روز سے حل شدہ ہیں۔ اس سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ انسان نے کائنات کی شاہراہ چھوڑ رکھی ہے۔ اگر وہ خود بھی اسی شاہراہ پر آجائے جس پر بقیہ تمام چیزیں چل رہی ہیں تو اس کے مسائل بھی اسی طرح حل ہو جائیں گے جس طرح بقیہ چیزوں کے مسائل حل ہو چکے ہیں۔

کائنات کی تمام چیزیں ایک ہی آفاقی قانون میں جکڑی ہوئی ہیں۔ مگر انسان کا یہ حال ہے کہ ہر ایک اپنے لئے الگ الگ راستہ اختیار کرنا چاہتا ہے۔ کائنات کی ہر چیز دوسروں کے لئے نفع بخش بن کر زندہ ہے۔ مگر انسان دوسروں کے استحصال پر اپنا مستقبل تعمیر کرنا چاہتا ہے۔ کائنات میں اگر کوئی چیز بلند ہے

تو وہ اپنا سایہ زمین پر ڈال کر تواضع کا اعتراف کرتی ہے۔ مگر انسان کو اگر کوئی بڑائی مل جائے تو وہ گھمنڈ کا اظہار کرتا ہے۔ کائنات میں ہر چیز صرف اپنے کام میں لگی ہوئی ہے، وہ کسی دوسرے سے نہیں ٹکراتی ۔مگر انسان دوسروں سے ٹکراتا ہے۔ وہ دوسرے کی تخریب پر اپنی تعمیر کا منصوبہ بناتا ہے۔ کائنات میں ایسے "سیلاب" آتے ہیں جن کو آزادانہ موقع دیا جائے تو وہ سخت تباہی پھیلائیں۔ مگر کائناتی نظام یہ کرتا ہے کہ ان کا رخ ندیوں اور سمندروں کی گہرائی کی طرف موڑ دیتا ہے۔ اس کے برعکس انسانوں کے یہاں جب منفی جذبات کا طوفان اٹھتا ہے تو وہ اس کے رخ کو نہیں پھیرتے۔ یہاں ہر آدمی صرف یہ جانتا ہے کہ اپنی آفت کو دوسرے کے اوپر ڈال دے۔

معاشرہ کی اصلاح کے سلسلے میں اصل ضرورت یہ ہے کہ اس تضاد کو ختم کیا جائے۔ انسانی معاشرہ کو بھی اسی آفاقی نظام کا پابند بنایا جائے جس میں بقیہ تمام کائنات جکڑی ہوئی ہے۔ جس دن ایسا ہوگا اسی دن انسانی زندگی کے تمام مسائل حل ہو جائیں گے۔ جس قانون کو اختیار کرنے کے نتیجے میں بقیہ کائنات کے مسائل حل شدہ ہیں اسی قانون کو اختیار کرنے سے انسانی زندگی کے مسائل کیوں کر حل نہ ہوں گے۔

اجتماعی مسائل

اجتماع کیا ہے۔ اجتماع دراصل افراد ہی کے مجموعہ کا دوسرا نام ہے۔ سوسائٹی کا سلوک دراصل فرد فرد کے سلوک ہی کا مجموعہ ہوتا ہے۔ افراد صحیح ہوں تو سوسائٹی صحیح ہوگی۔ افراد غلط ہوں تو سوسائٹی بھی غلط ہو جائے گی۔

خدا کا عقیدہ سوسائٹی کے ہر فرد کو صحیح ترین نقطۂ نظر دیتا ہے۔ وہ فرد فرد میں سنجیدگی پیدا کرتا ہے۔ اس طرح وہ ہر فرد کو اس قابل بناتا ہے کہ وہ وہی کرے جو بحیثیت مجموعی پوری انسانیت کے لئے مفید ہے۔ اور وہ نہ کرے جو مجموعی انسانیت کے لئے مفید نہیں۔

خدا کا عقیدہ عظیم ترین دریافت ہے۔ وہ آدمی کی پوری شخصیت کو ہلا دیتا ہے۔ اس کی مثال کیرم بورڈ سے دی جا سکتی ہے۔ کیرم کے کھیل میں بورڈ کے درمیان ۱۹ گوٹیں ہوتی ہیں۔ کھلاڑی اگر اسٹرائکر کو اس طرح مارے جس سے تمام گوٹوں پر زد پڑ جائے تو ایسی مار کو شاہ ضرب (Master Stroke) کہتے ہیں۔ خدا پر عقیدہ بھی اسی قسم کا ایک ماسٹر اسٹروک ہے۔

خدا پر عقیدہ انسان کی پوری ہستی پر ضرب لگاتا ہے۔ وہ آدمی کی تمام قوتوں کو متحرک بنا دیتا ہے۔ خدا پر عقیدہ بظاہر ایک چیز ہے مگر وہ انسان کو ہر پہلو سے ایک اصلاح یافتہ انسان بنا دیتا ہے۔ اس کے بعد

آدمی اس قابل ہوجاتا ہے کہ اس کی ہستی کا جو پہلو بھی دنیا میں ظاہر ہو وہ درست شکل میں ظاہر ہو، فطرت کے سیدھے راستہ سے وہ کسی حال میں انحراف نہ کرے۔ انسان کا پورا وجود خدا کی پکڑ میں ہے اس لئے خدا کا عقیدہ انسان کے پورے وجود کو متاثر کرنے والا بن جاتا ہے۔

۱۔ روح کو چھوڑ کر صرف جسم پر توجہ دینے کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ آدمی کے اندر متکامل شخصیت (Integrated personality) نہیں پیدا ہوتی۔ اپنے اندر کمی کا احساس اس کو مستقل طور پر غیر مطمئن رکھتا ہے۔ وہ اس احساس میں مبتلا رہتا ہے کہ اس کو جو کچھ پانا چاہئے تھا وہ ابھی تک اس کو نہ پا سکا۔

یہ احساس محرومی اکثر حالات میں سماجی برائیوں کا سبب ہے۔ سماج کے اندر ظلم و فساد کی حقیقت دوسرے لفظوں میں یہ ہے کہ ایک آدمی اپنی بے چینی کو دوسرے کے اوپر انڈیل دینا چاہتا ہے۔ ایک آدمی اپنی محروم خواہشوں کی تکمیل کے لئے دوسرے کے استغلال کا منصوبہ بناتا ہے مگر جب خدا کا عقیدہ اس کے ذہن میں اتر جائے تو اس کے بعد اس کے اندر متکامل شخصیت پیدا ہوتی ہے۔ وہ نفسیاتی پیچیدگیوں سے آزاد روح (Complex-free soul) بن جاتا ہے جس کو قرآن میں نفس مطمئنہ کہا گیا ہے۔ اس کے بعد اگر اس کے پاس کم ہو تو اس کے اندر احساس کمتری کی برائیاں پیدا نہیں ہوتیں۔ اس کے پاس زیادہ ہو تو وہ احساس برتری کے مرض میں مبتلا نہیں ہوتا۔ وہ ہر حال میں ایک معتدل انسان بنا رہتا ہے۔ اور یقینی طور پر یہی وہ چیز ہے جو کسی شخص کو بہتر سماجی فرد بناتی ہے۔

۲۔ دوسری چیز احساس ذمہ داری ہے۔ احساس ذمہ داری ہمیشہ اس وقت پیدا ہوتا ہے جب کہ آدمی یہ محسوس کرے کہ اس کے اوپر بھی کوئی طاقت ہے جو اس کو اپنی پکڑ میں لے سکتی ہے۔ خدا کو چھوڑنے کے بعد آدمی کے سامنے ایسی کوئی بلند تر طاقت باقی نہیں رہتی جس سے آدمی اندیشہ کرے اور جس کے سامنے جواب دہی کا احساس اس کو مجبور کرے کہ وہ سچائی پر قائم رہے۔

اس کے برعکس جب آدمی قادر مطلق خدا کو مانتا ہے تو اس کے فوراً بعد اس کے اندر یہ احساس پیدا ہوتا ہے کہ مجھے اس کے سامنے جواب دہی کرنی ہے۔ جواب دہی کا خیال اس کو اپنے قول و عمل میں بے حد حساس بنا دیتا ہے۔ یہ جذبہ اس کی پوری زندگی کو منظم کرتا ہے۔ وہ اس کے اوپر نگراں بن جاتا ہے۔ وہ اس کو ظلم اور استحصال (Exploitation) کے راستوں سے بچاتا ہے اور ہمیشہ انصاف اور بھلائی کو اختیار کرنے پر مجبور کرتا ہے۔ مشہور انگریز جج سر میتھیو ہیل (۱۶۷۶ - ۱۶۰۹) نے بجا طور پر لکھا ہے کہ "یہ کہنا کہ مذہب ایک فریب ہے، ان تمام ذمہ داریوں اور پابندیوں کو منسوخ کرنا ہے جن سے سماجی نظم کو برقرار رکھا جاتا ہے"

Religion without Revelation, by Julian Huxley, p. 155

کسی سوسائٹی کے بیشتر افراد جب اسلام کے تصور کے مطابق خدا کو اپنے عقیدے میں شامل کرلیں تو اس کے بعد اجتماعی معاملات میں زبردست تبدیلی پیدا ہوتی ہے۔ آدمی کا یہ احساس کہ خدا اس کو دیکھ رہا ہے اس کے اندر سے یہ مزاج ختم کر دیتا ہے کہ وہ اندر کچھ ہو اور باہر کچھ۔ ایسے لوگ دوسروں کا استحصال نہیں کرتے، کیوں کہ وہ جانتے ہیں کہ اس کا انھیں حساب دینا پڑے گا۔ ان کی زندگی خود رخی زندگی (Self-oriented life) کے بجائے خدا رخی زندگی (God-oriented life) بن جاتی ہے۔

خدا پر ایمان لانا ایک ایسی ہستی پر ایمان لانا ہے جو تمام طاقتوں کا مالک ہے۔ جو انسان کے دلوں تک کا حال جانتا ہے جو انسان سے اس کے تمام کھلے اور چھپے کا حساب لے گا۔ اس طرح خدا پر ایمان لانا آدمی سے اس کی خودی اور سرکشی کو چھین لیتا ہے۔ ایسا آدمی انتہائی سنجیدہ (Sincere) اور کامل طور پر حقیقت پسند بن جاتا ہے۔ یہی چیز ہر قسم کی اصلاح کا راز ہے۔ آدمی اگر سنجیدہ اور حقیقت پسند ہے تو وہ ہر کام کو صحیح طور پر انجام دے گا اور اگر وہ سنجیدہ اور حقیقت پسند نہ ہو تو جو کام بھی اس سے متعلق ہوگا اس کو وہ بگاڑ ڈالے گا۔ اسلام کے مطابق خدا کا عقیدہ آدمی کے اندر یہی سنجیدگی اور حقیقت پسندی پیدا کرتا ہے۔

ہماری دنیا میں جو انسان ہیں وہ سب برابر نہیں۔ یہاں کوئی طاقت ور ہے اور کوئی کمزور۔ یہی فرق ہر قسم کے ظلم و فساد پیدا کرتا ہے۔ جو شخص اپنے کو طاقت ور پاتا ہے وہ اس کے اوپر چڑھ دوڑتا ہے جس کو وہ بظاہر کمزور دیکھ رہا ہے۔

خدا پر ایمان برائی کی اس جڑ کو کاٹ دیتا ہے۔ خدا پر ایمان بتاتا ہے کہ اصل معاملہ انسان اور انسان کے درمیان نہیں بلکہ اصل معاملہ خدا اور انسان کے درمیان ہے۔ یہاں ایک طرف خدا ہے جس کے پاس ہر قسم کی طاقتیں ہیں اور دوسری طرف انسان ہے جس کو خدا کے مقابلہ میں کوئی طاقت حاصل نہیں۔ گویا یہاں زیادہ طاقت اور کم طاقت کی تقسیم نہیں بلکہ طاقت اور بے طاقتی کی تقسیم ہے (فاطر ۱۵)

خدا پر ایمان آدمی کے ذہن کو یکسر بدل دیتا ہے۔ ایسا آدمی اپنے معاملہ کو دوسرے انسانوں کی نسبت سے دیکھنے کے بجائے خدا کی نسبت سے دیکھنے لگتا ہے۔ کیونکہ بالآخر جس سے معاملہ پیش آنے والا ہے وہ خدا ہی ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ آدمی سے وہ تمام ظالمانہ خواہشیں حذف ہو جاتی ہیں جو اپنے معاملہ کو دوسرے انسانوں کی نسبت سے دیکھنے کی وجہ سے مصنوعی طور پر اس کے اندر پیدا ہوگئی تھیں۔ وہ اپنی حقیقی سطح پر آجاتا ہے۔ وہ انسانِ اصلی (Man cut to size) بن جاتا ہے۔

دو شخص یا دو قوم کے درمیان جب بھی نزاع پیدا ہو تو بیشتر حالات میں غلطی دونوں طرف ہوتی

ہے۔ اب ایسی حالات میں اگر ایک فریق اپنے حصہ کی غلطی مان لے تو دوسرا فریق بھی بآسانی اپنی غلطی کو ماننے پر راضی ہو جاتا ہے۔ اس کے برعکس اگر ایک فریق اپنے حصہ کی غلطی نہ مانے تو دوسرا فریق بھی اپنے حصہ کی غلطی ماننے پر راضی نہیں ہوتا۔ اس طرح جھگڑا بڑھتا رہتا ہے۔ یہاں تک کہ وہ اس حد تک پہنچ جاتا ہے جہاں سے واپسی ممکن نہیں ہوتی۔

ایسے تمام معاملات میں اصل مشکل یہ ہوتی ہے کہ جھگڑا پیدا ہوتے ہی دونوں فریق اس کو اپنی عزت (Prestige) کا مسئلہ بنا لیتے ہیں۔ ہر فریق بخوبی جانتا ہے کہ غلطی کا ایک جزء اس کی طرف بھی ہے۔ مگر یہ خیال اس کو اعتراف سے روکے رہتا ہے کہ اگر میں نے اپنی غلطی مان لی تو میری بے عزتی ہو جائے گی۔ اس اندیشہ کی بنا پر دونوں میں سے کوئی فریق اپنی غلطی کے اعتراف کے لئے تیار نہیں ہوتا۔

لیکن اگر دونوں میں سے کوئی ایک ایسا کرے کہ وہ پہل کر کے اپنے حصہ کی غلطی مان لے تو صورت حال فوراً بدل جائے گی۔ جو معاملہ پہلے عزت کا معاملہ تھا وہ اب توازن کا معاملہ بن جائے گا۔ اس کے بعد دوسرے فریق کے لئے اعتراف کرنا اپنے کو نیچا کرنے کے ہم معنی نہیں رہتا بلکہ وہی چیز کرنا بن جاتا ہے جو دوسرا فریق عملاً کر چکا ہے۔ گویا ایک فریق کا اعتراف دوسرے فریق کے اعتراف کو پیشگی طور پر متوازن کر دیتا ہے۔

یہی حقیقت پسندی زندگی کی اصلاح کا سب سے بڑا راز ہے۔ اور یہ حقیقت پسندی صرف خدا پرستی سے پیدا ہوتی ہے۔ خدا پر ایمان دراصل خدا کو کبیر مان کر اپنے آپ کو صغیر کے مقام پر رکھنا ہے۔ یہ ایمان اس حال میں وقوع میں آتا ہے کہ خدا اپنی کبریائی کو منوانے کے لئے ہمارے سامنے موجود نہیں ہوتا۔ اس اعتبار سے یہ کسی انسان کے لئے سب سے بڑی حقیقت پسندی ہے۔ اب جو شخص اس پر راضی ہو جائے کہ ساری بڑائی خدا کی طرف ہے اور ساری چھوٹائی میری طرف، وہ گویا اپنی "کوتاہی" کو آخری حد تک تسلیم کر چکا ہے۔ اور جو شخص اپنی کوتاہی کو آخری حد تک تسلیم کر لے وہ کیسے کسی بات کو عزت کا مسئلہ بنائے گا۔ ایسے آدمی کے لئے ہر دوسرا اعتراف اسی چیز کو چھوٹی سطح پر ماننا ہے جس کو وہ زیادہ بڑی اور آخری سطح پر پہلے ہی مان چکا ہے۔

قدرت کا نظام توازن کے اصول پر قائم ہے۔ توازن کو قائم رکھنے میں قدرت جن تدبیروں سے کام لیتی ہے ان میں سے ایک تحویل (Diversion) ہے۔ یعنی قوت کی فاضل مقدار کو دوسری طرف موڑ دینا۔ بارش کے موسم میں جو پانی برستا ہے اس کی ساری مقدار اگر کھیتوں اور آبادیوں میں رہ جائے تو زبردست نقصان ہو۔ ایسے موقع پر قدرت یہ کرتی ہے کہ پانی کی ضروری مقدار کھیتوں اور آبادیوں کو دے کر بقیہ تمام پانی دریاؤں کی طرف محول (Divert) کر دیتی ہے۔

اس اصول تحویل کو انسان نے مصنوعی طور پر بند (Dam) کی صورت میں اختیار کیا ہے۔ بند کا مقصد

یہ ہے کہ دریا کے پانی کے بے روک ٹوک بہاؤ پر کنٹرول قائم کیا جائے۔ جب بھی ایسا ہو کہ پانی حد سے بڑھتا ہوا نظر آئے تو اس کے رخ کو موڑ کر دوسری طرف کر دیا جائے تاکہ وہ دریا میں داخل ہو کر طغیانی نہ لا سکے بلکہ علیحدہ سے بنے ہوئے عظیم گڑھے میں جا کر گر جائے جس کو عام طور پر ذخیرۂ آب (Reservoir) کہا جاتا ہے۔ یہی اصول مشینوں میں بھی استعمال کیا جاتا ہے۔ مثلاً اسٹیم انجن میں جب اسٹیم کی مقدار متعینہ حد سے زیادہ ہو جاتی ہے تو اسٹیم کے رخ کو پھیر کر اسے باہر نکال دیا جاتا ہے۔

ایسا ہی کچھ معاملہ انسان کی اجتماعی زندگی کا بھی ہے۔ مختلف انسان جب مل جل کر رہتے ہیں تو ان کے درمیان بار بار شکایت کی باتیں پیدا ہوتی ہیں۔ ایک دوسرے کے خلاف دلوں میں تلخیاں ابھرتی ہیں۔ اگر اس شکایت اور تلخی کو بڑھنے دیا جائے تو اختلاف اور عناد اور مقابلہ کی نوبت آجاتی ہے۔ انسانی جماعت یا انسانی معاشرہ کا درست طور پر کام کرنا ناممکن ہو جاتا ہے۔

ان حالات میں انسان کے لئے بھی ایک ایسی چیز کی ضرورت ہے جس کی طرف اس کے جذبات کے مضر اضافہ کو موڑا جا سکے۔ خدا اور آخرت کا عقیدہ زندگی میں یہی کام کرتا ہے۔ وہ اجتماعیت کو نقصان پہنچانے والے جذبات کو انسان کی جانب سے موڑ کر خدا کی طرف کر دیتا ہے۔

حضرت یوسف کے سوتیلے بھائیوں نے آپ کو باپ سے جدا کر دیا۔ اس کے بعد آپ کے دوسرے سگے بھائی بن یامین کے ساتھ بھی اسی قسم کا حادثہ پیش آیا۔ ان ناخوشگوار واقعات کے بعد قدرتی طور پر حضرت یوسف کے والد حضرت یعقوب کے اندر شدید جذبات پیدا ہوئے۔ آپ اگر اپنے ان جذبات کا نشانہ حضرت یوسف کے سوتیلے بھائیوں کو بناتے تو زبردست انتشار اور اختلاف پیدا ہوتا۔ مگر آپ نے اپنے جذبات کے ہجوم کو خدا کی طرف موڑ دیا۔ آپ نے فرمایا: انما اشکوا بثی وحزنی الی اللہ۔ اسی طرح عمر فاروق رضؓ نے اپنی خلافت کے زمانہ میں اسلامی جنرل خالد بن الولید کو معزول کر دیا۔ یہ خالد بن الولید جیسے شخص کے لئے زبردست جھٹکا تھا۔ مگر انھوں نے اپنے تمام جذبات کو یہ کہہ کر خدا کی طرف موڑ دیا: انی لا اقاتل فی سبیل عمر ولکن اقاتل فی سبیل رب عمر (میں عمر کے راستہ میں نہیں لڑتا بلکہ خدا کے راستہ میں لڑتا ہوں)

یہ کسی انسانی معاشرہ کے لئے عقیدۂ آخرت کی بہت بڑی دین ہے۔ اس کی وجہ سے ایسا ہوتا ہے کہ آدمی اپنی شکایات کی تلافی کے لئے خدا کی طرف متوجہ ہو جاتا ہے۔ اس نے جو کچھ انسان سے نہیں پایا، اس کو وہ خدا سے پانے کی امید کر لیتا ہے۔ اس طرح خدا پرست آدمی کے منفی جذبات اپنے ہم جنسوں کی طرف رخ کرنے کے بجائے خدا کی طرف محول (Divert) ہوتے رہتے ہیں۔ جو پانی سیلاب بن کر انسانی آبادی کو نقصان

پہنچاتا وہ (Diversion Pool) میں جاکر گر جاتا ہے۔

خاتمہ

اس بحث کو میں جارج برنارڈ شا (۱۹۵۰-۱۸۵۶) کے ایک قول پر ختم کروں گا۔ برنارڈ شا نے ایک بار کہا کہ اگر محمد جیسا کوئی آدمی موجودہ دنیا کا ڈکٹیٹر ہو جائے تو وہ اس کے مسائل کو اس طرح حل کر دے گا کہ دنیا میں وہ امن اور خوشی قائم ہو جائے جس کی ہمیں بہت زیادہ ضرورت ہے۔

> If a man like Muhmmad were to assume the dictatorship of the modern world, he would solve its problems in a way that would bring it much needed peace and happiness.

محمد (صلے اللہ علیہ وسلم) کو جس چیز نے محمد بنایا وہ خدا پر کامل ایمان تھا۔ آپ کی زندگی مومن کامل کا نمونہ تھی۔ اس اعتبار سے اگر برنارڈ شا کے الفاظ کو بدل کر یہ کہا جائے تو بالکل درست ہو گا کہ —— آج دنیا میں اگر صحیح طور پر خدا کو ماننے والے پیدا ہو جائیں تو یقیناً دنیا میں امن قائم ہو جائے گا جس کی آج دنیا کو سب سے زیادہ ضرورت ہے۔

جمعیۃ علماء مالیریا کے تحت کوالالمپور میں ایک اسلامی کانفرنس ہوئی۔ یہاں ۵ نومبر ۱۹۸۳ کے پروگرام میں میرا ایک مقالہ (اسلام اور عصر حاضر) رکھا گیا تھا۔ زیر نظر مقالہ اس مقالہ کا اردو ترجمہ ہے جو اس موقع پر پیش کرنے کے لیے انگریزی میں تیار کیا گیا۔

ایک سفر

۱۶ اکتوبر ۱۹۸۳ کی شام کو ۹ بجے میں دہلی ایئرپورٹ کی انتظار گاہ میں تھا۔ مجھ کو جاپان ایئر لائنز سے روم ہوتے ہوئے افریقہ جانا تھا۔ اس اثنا میں بغل کی سیٹ سے دو خوش پوش مسافروں کی گفتگو کے یہ الفاظ میرے کان میں آئے :

آپ کہاں جارہے ہیں

روم

آپ کہاں جارہے ہیں

لندن

میں نے سوچا کہ انسان کس قدر بے خبر ہے۔ اس کی جیب میں چونکہ ہوائی جہاز کا ٹکٹ ہے ، اس لئے وہ سمجھتا ہے کہ وہ روم اور لندن جارہا ہے۔ وہ بھول گیا ہے کہ اس کے اوپر خدا کے طاقتور فرشتے مقرر ہیں جو اس انتظار میں ہیں کہ کب خدا کا حکم ہو اور وہ آدمی کو اپنی پکڑ میں لے کر اس کو خدا کی عدالت میں پہنچا دیں۔ آدمی بالآخر خدا کی دنیا میں جانے والا ہے۔ مگر وہ سمجھتا ہے کہ وہ خود اپنی دنیا میں جارہا ہے۔ انسان کی یہ بے خبری بھی کیسی عجیب ہے۔

جاپان ایئر لائنز کی فلائٹ نمبر ۴۶۷ سے میں نے روم تک کا سفر کیا۔ میں اکثر معروف کمپنیوں کے جہازوں میں سفر کر چکا ہوں۔ مگر جاپان ایئر لائنز مجھے سب سے بہتر معلوم ہوئی۔ اس جہاز کی ہر چیز دوسرے جہازوں سے بہتر تھی۔ جہاز کی بناوٹ، عملہ کی کارکردگی، مسافروں کی ضروریات کا اہتمام وغیرہ ہر چیز میں جاپان ایئر لائنز دوسری کمپنیوں سے ممتاز نظر آئی۔

روم سے طرابلس کا سفر الیتالیا کے ذریعہ طے ہوا۔ جہاز کی تقریباً نصف سیٹیں خالی نظر آئیں۔ اس کی وجہ غالباً یہ ہوگی کہ لیبیا میں بیرونی دنیا کے لئے تجارتی مواقع زیادہ نہیں۔ سیاحت کی کشش بھی لیبیا میں زیادہ نہیں ہے۔ اور آجکل ہوائی سفر زیادہ تر یا تجارت کے لئے ہوتا ہے یا سیاحت کے لئے۔

تاہم پٹرو ڈالر کی طاقت کا اندازہ اس سے ہوا کہ الیتالیا (Alitalia) میں دوران پرواز جب دن کا کھانا آیا تو اس کے ساتھ ٹرے میں ایک کارڈ بھی تھا جس میں عربی اور دوسری تین زبانوں میں یہ فقرہ لکھا ہوا تھا :

(الیتالیا) نضمن لکم ھذا الغذاء خالی من لحم الخنزیر (الیتالیا اس بات کی ذمہ داری لیتی ہے کہ اس کھانے میں خنزیر کا گوشت شامل نہیں ہے)

طرابلس میں میرا قیام فندق الکبیر کے کمرہ نمبر ۸۱۲ میں تھا۔ یہ کمرہ سمندر کی طرف کھلتا ہے۔ میرے سامنے دور تک نہایت پرکشش منظر تھا۔ سمندر کے کنارے پختہ فیلڈ بنی ہوئی تھی۔ اس میں کچھ لڑکے بےفکری کے ساتھ گیند کھیلتے ہوئے نظر آئے۔ اس منظر کو میں نے دیکھا تو اس میں مجھے دنیا میں پھیلے ہوئے غافل انسانوں کی تصویر دکھائی دی۔ بے اختیار میری زبان سے نکلا ——— لوگ کھیل رہے ہیں تاکہ وہ دوبارہ نہ کھیل سکیں۔ لوگ خوش ہیں تاکہ دوبارہ انھیں خوشیاں نصیب نہ ہوں۔ لوگ جھوٹی لذتوں میں گم ہیں تاکہ وہ خدا کی بڑی لذتوں سے ہمیشہ کے لئے محروم ہو جائیں۔

۱۲ اکتوبر ۱۹۸۲ کو صبح کا وقت تھا۔ میں سمندر کے رخ پر بیٹھا ہوا کمرہ کے باہر دیکھ رہا تھا سورج کی سنہری شعاعوں میں ہر چیز نہایت شاندار معلوم ہو رہی تھی۔ سڑک پر جدید ترین کاروں کا سیلاب بہہ رہا تھا۔ سمندر کا پانی موجیں مارتا ہوا عجیب حسین منظر پیش کر رہا تھا۔ آسمان پر بادل کے ٹکڑے آسمان کے آفاقی حسن میں اضافہ کر رہے تھے۔ سمندر میں جگہ جگہ سمندری جہاز ابھرے ہوئے دکھائی دیتے تھے۔

یہ مناظر دیکھتے دیکھتے اچانک مجھ پر ایک لمحاتی تجربہ گذرا۔ مجھے ایسا معلوم ہوا جیسے میں خدا کے دیکھنے کو دیکھ رہا ہوں۔ جیسے میں خدا کے ہونے کا تجربہ کر رہا ہوں۔ خدا بھی تو اسی طرح کائنات کو دیکھ رہا ہوگا۔ میں نے سوچا اگر یہ ممکن ہے کہ یہاں ایک انسان ہو۔ اس کو اپنی ذات کا شعور حاصل ہو۔ وہ سوچے اور دیکھے۔ کائنات سے الگ اس کی اپنی مستقل ہستی ہو۔ اگر ایسے ایک انسان کا وجود ممکن ہے تو خدا کا وجود کیوں کر ممکن نہیں۔

تھوڑی دیر کے لئے مجھے ایسا محسوس ہوا جیسے میری ذات میں خدا کی ذات شامل ہوگئی ہو۔ میں اپنے وجود میں خدا کے وجود کو دیکھنے لگا۔ میرا شعور ذات میرے لئے شعور خداوندی کے ہم معنی بن گیا۔ میں نے سوچا کہ جو لوگ خدا کے منکر ہیں انھیں اس سے پہلے خود اپنا انکار کرنا چاہیے۔ اور اگر وہ اپنا انکار نہیں کرسکتے تو انھیں یہ حق بھی حاصل نہیں کہ وہ خدا کے وجود کا انکار کریں۔

اس سفر میں میری ملاقات مختلف ملکوں کے مسلم دانش وروں سے ہوئی۔ ان سے گفتگو کے

دوران میں نے محسوس کیا کہ ہر ملک کے اعلیٰ تعلیم یافتہ مسلمانوں کے ذہن پر ایک ہی چیز چھائی ہوئی ہے۔ اور وہ ہے مسلمانوں کے اوپر غیر قوموں کے حملہ کا مسئلہ۔ چنانچہ ہر آدمی بس دفاعی ذہن کے تحت سوچتا ہے۔ ہر آدمی یہ سمجھتا ہے کہ اس وقت ہمارا سب سے بڑا مسئلہ مسلم دشمن طاقتوں کا مقابلہ کرنا ہے۔ اس کے بعد ہی کوئی دوسرا کام کیا جا سکتا ہے۔ حالانکہ صحیح بات یہ ہے کہ جب تک مسلمانوں کی طرف سے مقابلہ آرائی کا ماحول ختم نہ کیا جائے، ملّت کی تعمیر و ترقی کا کوئی حقیقی کام کرنا ممکن نہیں

سب سے عجیب بات جس کا مجھے بار بار تجربہ ہوا وہ یہ کہ آجکل دنیا بھر کے مسلمانوں میں "اسلامی دعوت" کا لفظ بہت زیادہ بولا جا رہا ہے۔ مگر اسلامی دعوت کا عملی مفہوم لوگوں کے ذہن میں شاید یہ ہے کہ مسلمانوں کے مسائل کے لئے جو بھی چیخ و پکار کی جائے وہ سب کا سب اسلامی دعوت ہے۔ حتیٰ کہ اسلامی دعوت کا لفظ موجودہ زمانہ میں مسلمانوں کی قومی دعوت کے ہم معنیٰ بن کر رہ گیا ہے۔

میں نے لوگوں کے سامنے اپنا یہ نقطۂ نظر پیش کیا کہ اپنی قوتوں کو قومی دفاع کے محاذ پر خرچ کرنا گویا سبب کو چھوڑ کر نتیجہ پر محنت کرنا ہے۔ ہمارے تمام مسائل دعوت الی اللہ کے کام کو چھوڑنے کا نتیجہ ہیں۔ جب تک امّت مسلمہ اپنے اس فرض منصبی کو ادا نہیں کرے گی وہ دوسری قوموں کی جارحیت کا شکار ہوتی رہے گی۔ اس صورت حال سے نکلنے کی اس کے سوا کوئی اور تدبیر نہیں۔

فندق الکبیر میں ۱۸ اکتوبر کو دوپہر کے کھانے میں میرے ساتھ دوسرے دو آدمی میز پر تھے۔ ایک صاحب یورپ کے ایک ملک سے آئے تھے، دوسرے امریکہ سے۔ ایک صاحب نے گفتگو کے دوران اپنی جیب سے دو رنگین فوٹو نکالے۔ یہ دو بچوں کے فوٹو تھے۔ ایک ۱۰ ماہ کا اور دوسرا دو سال کا۔ انھوں نے مسکراتے ہوئے کہا کہ یہ دونوں میرے بچے ہیں اور وہ میری زندگی ہیں (They are my life)

اس کے بعد دوسرے صاحب نے اپنی جیب میں ہاتھ ڈالا اور ایک چھوٹی بچی کا فوٹو نکال کر دکھاتے ہوئے کہا "یہ میری نواسی ہے اور میں ہر وقت اس کا فوٹو اپنی جیب میں رکھتا ہوں"
اسی طرح ایک بار ایک افریقی عالم کے ساتھ باہر جانا ہوا۔ راستہ میں بازار پڑتا تھا۔ وہ کپڑے کی ایک دکان میں گھسے اور اس طرح لال پیلے کپڑے کی خریداری شروع کر دی جیسے اس سے زیادہ اہم ان کے نزدیک کوئی کام ہی نہیں۔

میں نے سوچا کہ لوگوں کا حال یہ ہے کہ وہ اپنے بیوی بچوں میں جی رہے ہیں۔ اور یہی

لوگ ہیں جو بین اقوامی اسٹیج پر بیٹھ کر ملت اسلامیہ کے موضوع پر مجاہدانہ تقریریں کرتے ہیں۔

کناڈا سے آئے ہوئے ایک مسلمان پروفیسر نے سوال کیا کہ آپ کے اس قسم کے بیرونی سفروں کو انڈیا کی حکومت کس نظر سے دیکھتی ہے۔ میں نے کہا کہ میں ایک غیر سیاسی آدمی ہوں۔ اس لئے وہ اس میں کوئی خطرہ محسوس نہیں کرتے۔ بلکہ حسب ضرورت تعاون کرتے ہیں (جیسا کہ میں مالدیپ کے سفر کے ذیل میں لکھ چکا ہوں) وہ فوراً بولے :

مگر اسلام تو سیاست سکھاتا ہے اور ہر مسلمان کو سیاسی ہونا چاہئے۔

اس کے بعد مزید گفتگو کے دوران انھوں نے مہاتما گاندھی کا ذکر کیا اور کہا کہ :

He was an enemy of Islam

میں نے کہا کہ یہ صحیح نہیں۔ مہاتما گاندھی اسلام دشمن نہیں تھے۔ زیادہ سے زیادہ آپ یہ کہہ سکتے ہیں کہ وہ اس مسلم سیاست کے مخالف تھے جو تقسیم ملک کے نظریہ کے تحت ہندستانی مسلمانوں نے چلائی تھی۔ آپ چاہیں تو انھیں تقسیم دشمن کہہ سکتے ہیں مگر اسلام دشمن کہنا سراسر غلط ہے۔

یہ سن کر وہ مسکرائے اور کہا کہ آپ ہم کو حکومت ہند کے آدمی معلوم ہوتے ہیں —— موجودہ مسلمانوں کی یہی منفی ذہنیت ہے جس نے ان سے حقیقت پسندانہ طرز فکر کو چھین لیا ہے۔ اور جس قوم سے حقیقت پسندانہ طرز فکر چھن جائے اس سے گویا سب سے بڑی چیز چھن گئی۔ ایسی قوم کا انجام صرف یہ ہے کہ وہ اپنے مفروضہ تخیلات کی دنیا میں جیتی رہے۔ اس کو خدا کی حقیقی دنیا میں کبھی کوئی جگہ نہیں مل سکتی۔

۲۰ اکتوبر کو طرابلس کے ایک اخبار کے نمائندہ نے صحافتی انٹرویو لیا۔ انھوں نے ہمارے اسلامی مرکز سے متعلق اور عالم اسلام سے متعلق بہت سے سوالات کئے۔ ایک سوال یہ تھا کہ دور جدید کے مسلم مسائل کے بارے میں آپ کس طرح سوچتے ہیں۔ میں نے کہا کہ مسلمانوں کے تمام مسائل ان کی اسلام سے غفلت کا نتیجہ ہیں۔ جب تک یہ اصل وجہ دور نہ کی جائے کسی اور تدبیر سے مسلمانوں کے مسائل حل نہیں ہو سکتے۔

اسلامی مرکز کے بارہ میں میں نے بتایا کہ وہ ۱۹۷۰ سے قائم ہے اور ماہنامہ الرسالہ اور کتابوں اور اجتماعات کے ذریعے پورے ملک میں خاموشی کے ساتھ کام کر رہا ہے۔ اسلامی مرکز ایک خالص غیر سیاسی ادارہ ہے جس کا مقصد مسلمانوں میں حقیقی اسلام کو زندہ کرنا ہے اور غیر مسلم اقوام کو سچے اسلام سے متعارف کرنا ہے۔ میں نے بتایا کہ اسلامی مرکز کا صدر دفتر دہلی میں ہے اور اس کا ایک تحتی مرکز حیدرآباد میں قائم کیا گیا ہے۔ ہمارا منصوبہ ہے کہ دہلی کے مرکز کو اردو اور عربی

اور انگریزی اور ہندی میں اسلامی لٹریچر کی فراہمی کا مرکز بنائیں اور حیدر آباد کے تحتی مرکز کو ملک کی دوسری علاقائی زبانوں کا۔

طرابلس سے واپسی میں میں نے لیبین ایر لائنز کے ذریعہ سفر کیا۔ یہ جہاز پہلے دمشق میں اترا۔ اس کے بعد اس نے مجھ کو کویت پہنچایا۔

ظہر اور عصر کی نمازیں میں نے اسی جہاز پر ادا کیں۔ ۳۵ ہزار فٹ کی بلندی پر اڑتے ہوئے جب میں نے اپنا سر سجدہ میں رکھا تو عجیب احساس ہوا۔ سطح زمین پر سجدہ کرنے کے بجائے یہ فضا میں سجدہ تھا۔ جہاز جب فضا میں اڑ رہا ہوتا ہے تو بیک وقت دو چیزوں کا شدید احساس ہوتا ہے۔ ایک یہ کہ مادہ کو خدا نے کس طرح انسان کے لئے مسخر کر دیا ہے کہ وہ اس کو لئے ہوئے فضا میں اڑا چلا جا رہا ہے۔ اسی کے ساتھ دوسرا احساس اپنی بے چارگی کا رہتا ہے۔ دوران پرواز اگر جہاز میں کوئی خرابی ہو جائے تو اس کے بعد صرف موت ہوتی ہے جو مسافر کا انتظار کر رہی ہوتی ہے۔ سجدہ میں یہ دونوں احساسات اس طرح سمٹ آئے کہ دیر تک سجدہ سے سر اٹھانے کا جی نہ چاہا۔ دل نے کہا: خدایا، کیسے عجیب ہیں تیرے کرشمے اور کیسے عجیب ہیں وہ لوگ جو ان کرشموں کو دیکھ کر بھی نہیں تڑپتے۔ جن کی آنکھیں بدستور خشک رہتی ہیں اور جن کی دنیا اس کے بعد بھی تیری گذرگاہ نہیں بنتی۔

کویت میں جہاز بدلنا تھا مگر یہاں تاخیر سے پہنچنے کی وجہ سے برٹش ایرویز کا اگلا جہاز چھوٹ گیا۔ اس لئے کویت میں مجھ کو ۲۴ گھنٹہ رکنا پڑا۔ ۲۴ اکتوبر ۱۹۸۳ کو دوبارہ میں دہلی واپس آ گیا۔

طرابلس سے کویت تک کا سفر میں نے لیبین ایرویز کے ذریعہ طے کیا۔ کویت سے دہلی کا سفر مجھے برٹش ایرویز کے ذریعہ طے کرنا تھا۔ مگر لیبین ایرویز کا جہاز لیٹ ہو گیا۔ ہم کویت اس حال میں پہنچے کہ جب لیبین ایرویز کا جہاز ہم کو لے کر کویت کے ہوائی اڈہ پر اتر رہا تھا تو برٹش ایرویز کا جہاز کویت کے ہوائی اڈہ سے پرواز کر رہا تھا۔

میں نے سوچا کہ زندگی کا بڑا سفر بھی آدمی کو اسی طرح مرحلہ وار طے کرنا ہوتا ہے۔ یہاں بھی ایک "جہاز" کے بعد دوسرا "جہاز" درکار ہوتا ہے جو آدمی کے سفر کو برابر جاری رکھے۔ جس آدمی کی نظر صرف سامنے کی سواری پر ہو، اگلی سواری سے وہ بے خبر ہو تو عین ممکن ہے کہ جب وہ ایک مرحلہ سے گذر کر دوسرے مرحلہ میں پہنچے تو وہاں صرف یہ خبر اس کو سننے کو ملے کہ اگلے جہاز کا وقت آ چکا تھا اس لئے وہ تم کو لئے بغیر چلا گیا۔ —— پہلے زینہ پر قدم رکھتے ہوئے اگلے زینہ پر بھی نگاہ رکھئے، اسی وقت آپ سلامتی کے ساتھ چھت تک پہنچ سکتے ہیں۔

AL-RISALA

ماہنامہ الرسالہ کا انگریزی اڈیشن چھپ گیا ہے۔
فروری ۱۹۸۴ء کا شمارہ اس کا پہلا نمبر ہے۔
انگریزی الرسالہ کا زرِتعاون اور ایجنسی کی شرائط وہی ہیں جو
اردو الرسالہ کی ہیں۔

ذیل کے پتہ پر رابطہ قائم فرمائیں:

C-29, Nizamuddin West,
New Delhi 110 013

INTRODUCTION TO ISLAM SERIES

1. The Way to Find God.
2. The Teachings of Islam.
3. The Good Life.
4. The Garden of Paradise.
5. The Fire of Hell.

The series provides the general public with an accurate and comprehensive picture of Islam-the true religion of submission to God.

MAKTABA AL-RISALA
C-29 Nizamuddin West, New Delhi 110 013

ایجنسی : ایک تعمیری اور دعوتی پروگرام

الرسالہ عام معنوں میں صرف ایک پرچہ نہیں، وہ تعمیر ملت اور احیاء اسلام کی ایک مہم ہے جو آپ کو آواز دیتی ہے کہ آپ اس کے ساتھ تعاون فرمائیں۔ اس مہم کے ساتھ تعاون کی سب سے آسان اور بے ضرر صورت یہ ہے کہ آپ الرسالہ کی ایجنسی قبول فرمائیں۔

"ایجنسی" اپنے عام استعمال کی وجہ سے کاروباری لوگوں کی دلچسپی کی چیز سمجھی جانے لگی ہے۔ مگر حقیقت یہ ہے کہ ایجنسی کا طریقہ دور جدید کا ایک مفید عطیہ ہے جس کو کسی فکر کی اشاعت کے لئے کامیابی کے ساتھ استعمال کیا جا سکتا ہے۔ کسی فکری مہم میں اپنے آپ کو شریک کرنے کی یہ ایک انتہائی ممکن صورت ہے اور اسی کے ساتھ اس فکر کو پھیلانے میں اپنا حصہ ادا کرنے کی ایک بے ضرر تدبیر بھی۔

تجربہ یہ ہے کہ بیک وقت سال بھر کا زر تعاون روانہ کرنا لوگوں کے لئے مشکل ہوتا ہے۔ مگر پرچہ سامنے موجود ہو تو ہر مہینے ایک پرچہ کی قیمت دے کر وہ بآسانی اس کو خرید لیتے ہیں۔ ایجنسی کا طریقہ اسی امکان کو استعمال کرنے کی ایک کامیاب تدبیر ہے۔ الرسالہ کی تعمیری اور اصلاحی آواز کو پھیلانے کی بہترین صورت یہ ہے کہ جگہ جگہ اس کی ایجنسی قائم کی جائے۔ بلکہ ہمارا ہر ہمدرد اور متفق اس کی ایجنسی لے۔ یہ ایجنسی گویا الرسالہ کو اس کے متوقع خریداروں تک پہنچانے کا ایک کارگر درمیانی وسیلہ ہے۔

وقتی جوش کے تحت لوگ ایک "بڑی قربانی" دینے کے لئے بآسانی تیار ہو جاتے ہیں۔ مگر حقیقی کامیابی کا راز ان چھوٹی چھوٹی قربانیوں میں ہے جو سنجیدہ فیصلہ کے تحت لگاتار دی جائیں۔ ایجنسی کا طریقہ اس پہلو سے بھی اہم ہے یہ ملت کے افراد کو اس کی مشق کراتا ہے کہ ملت کے افراد چھوٹے چھوٹے کاموں کو کام سمجھنے لگیں۔ ان کے اندر یہ حوصلہ پیدا ہو کہ وہ مسلسل عمل کے ذریعہ نتیجہ حاصل کرنا چاہیں نہ کہ یکبارگی اقدام سے۔

ایجنسی کی صورتیں

پہلی صورت ——— الرسالہ کی ایجنسی کم از کم پانچ پرچوں پر دی جاتی ہے۔ کمیشن ۲۵ فی صد ہے۔ پیکنگ اور روانگی کے اخراجات ادارہ الرسالہ کے ذمہ ہوتے ہیں۔ مطلوبہ پرچے کمیشن وضع کر کے بذریعہ وی پی روانہ کئے جاتے ہیں۔ اس اسکیم کے تحت ہر شخص ایجنسی لے سکتا ہے۔ اگر اس کے پاس کچھ پرچے فروخت ہونے سے رہ گئے ہیں تو اس کو پوری قیمت کے ساتھ واپس لے لیا جائے گا۔ بشرطیکہ پرچے خراب نہ ہوئے ہوں۔

دوسری صورت ——— الرسالہ کے پانچ پرچوں کی قیمت بعد وضع کمیشن ۱۱ روپیہ ۲۵ پیسے ہوتی ہے۔ جو لوگ صاحب استطاعت ہیں وہ اسلامی خدمت کے جذبہ کے تحت اپنی ذمہ داری پر پانچ پرچوں کی ایجنسی قبول فرمائیں۔ خریدار ملیں یا نہ ملیں، ہر حال میں پانچ پرچے منگوا کر ہر ماہ لوگوں کے درمیان تقسیم کریں۔ اور اس کی قیمت خواہ سالانہ ۱۳۵ روپے یا ماہانہ ۱۱ روپیہ ۲۵ پیسے دفتر الرسالہ کو روانہ فرمائیں۔

ثانی اثنین خاں پرنٹر پبلشر مسئول نے جے کے آفسٹ پرنٹرز دہلی سے چھپوا کر دفتر الرسالہ جمعیۃ بلڈنگ قاسم جان اسٹریٹ سے شائع کیا

Regd. R.N. No. 28822/76
Regd. D(DN) No. 532

February 1984
Issue No. 87

AL-RISALA MONTHLY